انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی —— مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جلد:۲، شمارہ:۱۲، اگست ۲۰۱۸ء/ذی القعدہ۔ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی............نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی............لکھنؤ

انیس احمد فلاحی............جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Ali,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
Printed at: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Abul Aala Sayyed**

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلیٰ سید سبحانی	۳
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۳۲)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۵
افادات جلیل احسن ندویؒ (۹)	ظفر احمد الاثری	۱۴
پردیس کی زندگی اور اسلام	ابوالاعلیٰ سید سبحانی	۲۴
اظہار رائے کی اخلاقیات	رضوان احمد فلاحی	۳۷
خطبہ حجۃ الوداع کی عصری معنویت	جوہر جاوید گیاوی	۴۲
مطالعہ: ضرورت، اہمیت اور جہات	شمشاد حسین فلاحی	۵۲
ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ: پیکر صبر واستقامت	ڈاکٹر محمد افضل فلاحی	۶۰
مولانا محمد ایوب اصلاحی کا سانحہ ارتحال	مولانا محمد طاہر مدنی	۶۷
مولانا مطیع اللہ فلاحی	ڈاکٹر امتیاز وحید	۷۲
مشاہیر کے خطوط	ادارہ	۷۷
شعر ونغمہ	شرکائے بزم	۸۰
تعارف وتبصرہ	محمد اسعد فلاحی، سعید اختر اعظمی	۸۳
آپ کے خطوط	قارئین	۸۷
جامعہ کے لیل ونہار واخبار انجمن	مصباح الباری فلاحی	۸۹

خط وکتابت وارسال زر کا پتہ

Zeeshan Apartment, F-9, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Email: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل نمبر (مدیر مسئول): +91-9811126467

موبائل نمبر (مدیر): +91-9891051676

اداریہ

اپنی بات

سماجی تعلقات کی ایک اہم اسلامی بنیاد مختلف مذاہب میں موجود مقدسات کا احترام بھی ہے۔ قرآن مجید بھی اس سلسلے میں واضح رہنمائی فرماتا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ سے بھی اس سلسلے میں واضح رہنمائی ملتی ہے۔

اسلام ہی واحد، سچا اور رب کائنات کا نازل کردہ آخری اور مکمل دین ہے، قرآن مجید میں صاف صاف اعلان ہے، ان الدین عنداللہ الاسلام۔ اس عظیم حقیقت کے اعلان کے باوجود اسلام انسانی مزاج کی رعایت کرتے ہوئے انسانی معتقدات اور انسانی سماج کے درمیان پائے جانے والے مقدسات کے احترام کی تعلیم دیتا ہے۔

مدینے میں نجران کے عیسائی وفد کے ساتھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کشادہ ظرفی اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا، وہ احترام مقدسات کے سلسلے میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ یہ عالمی سطح پر مذاہب کے درمیان رواداری اور مقدسات کے احترام کے سلسلے کی ایک عظیم اور تاریخی مثال ہے۔ عام الوفود سنہ ۱۰ھ میں جن دنوں نجران کا عیسائی وفد مدینہ آیا، یہ ان کی عید کا موقع تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے مسجد نبوی کو خالی کر دیا، جہاں انہوں نے مکمل آزادی اور پورے اہتمام کے ساتھ اپنی عید منائی۔ امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو یوں بیان فرماتے ہیں:

فتح رسول الله صلى الله عليه وسلم مسجد النبوة لهم، فصلوا فيه صلوة عيد الفصح الذى حان موعده، وهم ضيوف على الرسولؐ۔ (زاد المعاد، ابن القيم، ۵۴۹/۳۔ ۵۵۰)

قرآن مجید نے تو سنت تدافع یا سنت دفع کو بھی صرف اسلامی مقدسات تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ دیگر مقدسات دینیہ کو بھی اس میں شامل رکھا ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيراً۔ (سورة الحج: ٤٠)

(اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) خلوت خانے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں اللہ

کا خوب خوب ذکر کیا جاتا ہے ویران ہو چکی ہوتیں۔)

اسلام مذہبی شخصیات کے احترام کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام مذہبی کتابوں کے احترام کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام مذہبی مقامات کے احترام کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام سماجی تعلقات کو احترام اور محبت کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے، جہاں ہر کسی کو احترام حاصل ہو، جہاں ہر کسی کو یکساں طور پر عدل وانصاف حاصل ہو، جہاں ہر کسی کو امن وامان حاصل ہو، جہاں کسی کے ساتھ غیر انسانی اور غیر فطری رویے نہ اختیار کیے جاتے ہوں اور جہاں کسی کی دل آزاری یا دل شکنی نہ کی جاتی ہو۔

قرآن مجید اہل ایمان کو داعیانہ کردار کا حامل دیکھنا چاہتا ہے، وہ ہر کسی کے خیر خواہ ہوں، وہ ہر کسی کے ساتھ ہمدردی اور اخوت انسانی پر مبنی تعلقات استوار کریں، وہ مختلف خیالات وافکار رکھنے والے دنیا بھر کے انسانوں کو اپنے مشن سے قریب کرنے کا فن جانتے ہوں، وہ بشروا ولاتنفروا کی عملی تصویر ہوں، چنانچہ قرآن مجید اپنی دعوت میں انسانی فطرت اور انسانی مزاج کی پوری پوری رعایت کرتا ہے۔

ایمان بالکتب اور ایمان بالرسل کی ایک حکمت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ انسانی دنیا کے سامنے واضح طور سے یہ پیغام پہنچ جائے کہ اسلام کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ اسی سلسلۂ ہدایت کا آخری، ہمیشہ محفوظ رہنے والا اور مکمل دین ہے جس سلسلۂ ہدایت سے اب تک کے تمام پیغمبر اور اب تک کی تمام کتب سماوی کا تعلق ہے۔ یقیناً اہل ایمان تمام تحریف شدہ مذاہب اور مذہبی کتابوں سے منھ موڑ کر صرف اور صرف قرآن مجید سے وابستگی کا اعلان کرتے ہیں، تاہم وہ تمام کتابوں اور تمام رسولوں کے من جانب اللہ ہونے پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اور اسی لیے سب کتابوں اور سب رسولوں کا یکساں طور پر احترام بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید سماجی تعلقات کو اس عظیم اعتراف کے ساتھ قائم کرتا ہے اور اس اعتراف کو ایمان کا حصہ بھی بناتا ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّهِ وَمَلآئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ۔ (البقرة: ٢٨٥)

(رسول ایمان لایا اس چیز پر جو رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ان کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔)

(ابوالاعلی سید سبحانی)

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۳۲)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ای میل:mohiuddin.ghazi@gmail.com

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

----

(۱۴۰) الی برائے ظرف

جس طرح لام کبھی خالص ظرف کا مفہوم بتانے کے لیے آتا ہے، جیسے:

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ (آل عمران:25) اسی طرح الی بھی کبھی خالص ظرف کا مفہوم بتانے کے لیے آتا ہے۔

مندرجہ ذیل آیتوں میں الی کا ترجمہ عام طور سے مترجمین نے ظرف کا کیا ہے، البتہ صاحب تدبر نے الی کا ترجمہ اس طرح کے مقامات پر غایت ہی کا کیا ہے:

(۱) لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (النساء:87)

''وہ تم سب کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا'' (سید مودودی)

''وہ تم سب کو یقیناً قیامت کے دن جمع کرے گا'' (محمد جوناگڑھی)

''وہ ضرور تمہیں اکٹھا کرے گا قیامت کے دن'' (احمد رضا خان)

''وہ تم سب کو قیامت کے دن کی طرف لے جا کر رہے گا'' (امین احسن اصلاحی)

(۲) لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (الأنعام:12)

''بیشک ضرور تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا'' (احمد رضا خان)

''قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا'' (سید مودودی)

''تم کو اللہ قیامت کے روز جمع کرے گا'' (محمد جوناگڑھی)

''وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت کے دن کی طرف'' (امین احسن اصلاحی)

(۳) ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ (الجاثیۃ:26)

''پھر تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں'' (محمد جوناگڑھی)

''پھر وہی تم کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں'' (سید مودودی)

''پھر تم سب کو اکٹھا کرے گا قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں'' (احمد رضا خان)

''پھر وہ تم کو روز قیامت تک، جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، تم کو جمع کرے گا'' (امین احسن اصلاحی)

(۴) لَمَجْمُوعُونَ إِلَى مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ۔ (الواقعۃ:50)

''ضرور اکٹھے کیے جائیں گے، ایک جانے ہوئے دن کی میعاد پر'' (احمد رضا خان)

''ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے'' (سید مودودی)

''ضرور جمع کئے جائیں گے ایک مقرر دن کے وقت'' (محمد جونا گڑھی)

''سب جمع کئے جائیں گے، ایک معین دن کی مقررہ مدت تک'' (امین احسن اصلاحی)

صاحب تدبر نے عام ترجموں سے ہٹ کر جو ترجمہ کیا ہے وہ کمزور معلوم ہوتا ہے۔ قیامت کے دن جمع کرنا ایک صاف اور واضح بات ہے، جبکہ قیامت کے دن تک جمع کرنے میں واضح طور پر تکلف دکھائی دیتا ہے۔

غرض جو مفہوم جَمَعۡنَاهُمۡ لِيَوۡمٍ لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ میں لام کا ہے وہی مفہوم يَجۡمَعُكُمۡ إِلَى يَوۡمِ الۡقِيَامَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ میں الی کا ہے۔

(۵) ثُمَّ إِنَّ مَرۡجِعَهُمۡ لَإِلَى الۡجَحِيۡمِ (الصافات:68)

مذکورہ بالا مقامات کے برخلاف اس آیت میں عام طور سے لوگوں نے الی کا ترجمہ غایت کا کیا ہے:

پھر ان کو لے جانا آگ کے ڈھیر میں (شاہ عبدالقادر)

پھر ان کی بازگشت ضرور بھڑکتی آگ کی طرف ہے (احمد رضا خان)

پھر ان کو دوزخ کی طرف لوٹایا جائے گا (فتح محمد جالندھری)

اور اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی (سید مودودی)

مذکورہ بالا ترجموں سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ لوگ زقوم کھانے کے لیے دوزخ سے باہر کہیں جائیں گے، اور پھر دوزخ کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ لیکن یہ مفہوم لینا درست نہیں ہے، کیونکہ زقوم کا درخت جہنم کے باہر نہیں بلکہ جہنم کے بیچوں بیچ ہوگا، جیسا کہ اسی سیاق میں اس آیت سے پہلے واضح طور سے بتایا گیا ہے، اس لیے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ وہ کھانے پینے کے لیے دوزخ یا جحیم سے باہر کہیں جائیں گے۔ مولانا امانت اللہ اصلاحی کے نزدیک یہاں بھی الی برائے ظرف ہے، اور اس کے مطابق ترجمہ ہوگا: ''پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہوگی'' یہ بھی واضح رہے کہ یہاں ثم (پھر) زمانی ترتیب کے لیے نہیں ہے بلکہ (مزید برآں) کے مفہوم میں ہے۔

مندرجہ ذیل ترجمہ میں بھی غالبا اسی کا لحاظ کیا گیا ہے: ''پھر ان سب کا آخری انجام جہنم ہوگا'' (جوادی)

(۱۴۱) القول اور کلمة فیصلے کے معنی میں

قرآن مجید میں القول کا لفظ ایک خاص اسلوب میں استعمال ہوا ہے، اس اسلوب کے لیے القول کے ساتھ تین مختلف افعال استعمال ہوئے ہیں، جیسے حق علیه القول، اور وقع علیه القول، اور سبق

عليه القول۔

القول کی طرح کلمۃ کا لفظ بھی اسی خاص اسلوب میں استعمال میں ہوتا ہے، جیسے حقت علیه کلمة، اور سبقت کلمة۔

مترجمین قرآن کے یہاں ایسے مقامات کا ترجمہ دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ کرنے والوں کو ان کا مفہوم متعین کرنے میں دشواری ہوئی ہے، اور وہ مختلف مقامات پر مختلف ترجمے کرتے ہیں، بسا اوقات ان ترجموں کو سمجھنا بھی دشوار ہوتا ہے، کہ ان کی مراد کیا ہے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی ان تمام مقامات پر ایک ہی ترجمہ تجویز کرتے ہیں، اور وہ ہے فیصلہ ہونا۔ اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایسے ہر مقام پر بہت اچھی طرح موزوں ہوجاتا ہے، مزید یہ کہ اس ترجمہ سے پوری آیت کا مفہوم اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ ذیل میں مثالوں کے ذریعہ سے یہ بات اور واضح ہوگی:

(۱) وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُواْ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيراً۔ (الإسراء:16)

''جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہوجاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں'' (سید مودودی)

''تو اس پر بات پوری ہوجاتی ہے'' (احمد رضا خان)

''تو ان پر (عذاب کی) بات ثابت ہوجاتی ہے'' (محمد جونا گڈھی)

''پس ان پر بات پوری ہوجاتی ہے'' (امین احسن اصلاحی)

''پس اس کے سلسلے میں فیصلہ ہوجاتا ہے'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۲) وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ـ قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَؤُلَاء الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ۔ (القصص:62-63)

''اور (بھول نہ جائیں یہ لوگ) اُس دن کو جب کہ وہ اِن کو پکارے گا اور پوچھے گا" کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟" یہ قول جن پر چسپاں ہوگا وہ کہیں گے اے ہمارے رب، بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا، اِنہیں ہم نے اُسی طرح گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے

ہم آپ کے سامنے برائت کا اظہار کرتے ہیں یہ ہماری تو بندگی نہیں کرتے تھے‘‘ (سید مودودی)

’’کہیں گے وہ جن پر بات ثابت ہو چکی‘‘ (احمد رضا خان)

’’(تو) جن لوگوں پر (عذاب کا) حکم ثابت ہو چکا ہوگا وہ کہیں گے‘‘ (فتح محمد جالندھری)

جن کے خلاف فیصلہ ہو چکا ہوگا (امانت اللہ اصلاحی)

(۳) وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ (السجدہ:13)

’’اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے۔ لیکن میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا (جالندھری)

مگر میری وہ بات پُوری ہو گئی جو میں نے کہی تھی‘‘ (سید مودودی)

’’مگر میری بات قرار پا چکی‘‘ (احمد رضا خان)

’’مگر میرا فیصلہ ہو چکا ہے‘‘ (امانت اللہ اصلاحی)

(۴) لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَى أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ۔ (یس:7)

’’بیشک ان میں اکثر پر بات ثابت ہو چکی ہے تو وہ ایمان نہ لائیں گے‘‘ (احمد رضا خان)

’’اِن میں سے اکثر لوگ فیصلہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں‘‘ (سید مودودی)

’’ان میں سے اکثر پر (خدا کی) بات پوری ہو چکی ہے‘‘ (فتح محمد جالندھری)

’’ان میں سے اکثر کے خلاف فیصلہ ہو چکا ہے‘‘ (مطلب ان کے ایمان نہ لانے کا فیصلہ ہو چکا ہے، لہذا وہ ایمان نہیں لائیں گے، یعنی جو فیصلہ ہو چکا ہے اس کا نتیجہ بھی بیان کر دیا) (امانت اللہ اصلاحی)

(۵) فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا إِنَّا لَذَائِقُونَ۔ (الصافات:31)

’’آخر کار ہم اپنے رب کے اِس فرمان کے مستحق ہو گئے کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں‘‘ (سید مودودی)

’’تو ثابت ہو گئی ہم پر ہمارے رب کی بات‘‘ (احمد رضا خان)

’’سو ہمارے بارے میں ہمارے پروردگار کی بات پوری ہو گئی‘‘ (فتح محمد جالندھری)

’’ہمارے خلاف ہمارے رب کا فیصلہ صادر ہو گیا‘‘ (امانت اللہ اصلاحی، آگے فیصلہ کا بیان نہیں بلکہ فیصلہ کے نتیجہ کا بیان ہے)

(۶) أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ أَفَأَنتَ تُنقِذُ مَن فِیُ النَّارِ ۔(الزمر:19)

''بھلا جس شخص پر عذاب کا حکم صادر ہو چکا۔تو کیا تم (ایسے) دوزخی کو مخلصی دے سکو گے'' (فتح محمد جالندھری)

''جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو'' (سید مودودی)

''جس پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی'' (احمد رضا خان)

''جس کے سلسلے میں عذاب کا فیصلہ ہو چکا'' (امانت اللہ اصلاحی) (جو فیصلہ ان کے کرتوتوں کے نتیجے میں ابھی ہوا ہے وہ مراد ہے)

(۷) أُوْلَـئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِیُ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ۔ (الأحقاف:18)

''یہ وہ ہیں جن پر بات ثابت ہو چکی ان گروہوں میں جو ان سے پہلے گزرے جن اور آدمی'' (احمد رضا خان)

''یہ وہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے'' (سید مودودی)

''وہ لوگ ہیں جن پر (اللہ کے عذاب کا) وعدہ صادق آ گیا'' (محمد جونا گڑھی)

''یہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی وعید پوری ہوئی'' (امین احسن اصلاحی)

(۸) كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُواْ أَنَّهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ۔(یونس:33)

''اسی طرح خدا کا ارشاد ان نافرمانوں کے حق میں ثابت ہو کر رہا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے'' (فتح محمد جالندھری)

''اس طرح نافرمانی اختیار کرنے والوں پر تمہارے رب کی بات صادق آ گئی'' (سید مودودی)

''یونہی ثابت ہو چکی ہے تیرے رب کی بات فاسقوں پر'' (احمد رضا خان)

''اس طرح نافرمانی کرنے والوں کے سلسلے میں تیرے رب کا فیصلہ صادر ہو گیا'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۹) إِنَّ الَّـذِيْـنَ حَـقَّـتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ۔ وَلَوْ جَاء تْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّى يَرَوُاْ الْعَذَابَ الأَلِيْمَ۔(یونس:96،97)

''بیشک وہ جن پر تیرے رب کی بات ٹھیک پڑ چکی ہے ایمان نہ لائیں گے اگرچہ سب نشانیاں ان کے پاس آئیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں'' (احمد رضا خان)

''جن لوگوں پر تیرے رب کا قول راست آ گیا ہے'' (سید مودودی)
''جن لوگوں کے بارے میں خدا کا حکم (عذاب) قرار پا چکا ہے'' (فتح محمد جالندھری)
''جن کے سلسلے میں تیرے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۱۰) وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ زُمَراً حَتَّى إِذَا جَاؤُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاء يَوْمِكُمْ هَذَا قَالُوا بَلَى وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ۔ (الزمر:71)

''اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے گروہ گروہ یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے داروغہ ان سے کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے وہ رسول نہ آئے تھے جو تم پر تمہارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمہیں اس دن سے ملنے سے ڈراتے تھے، کہیں گے کیوں نہیں مگر عذاب کا قول کافروں پر ٹھیک اترا'' (احمد رضا خان)
''مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا'' (سید مودودی)
''لیکن عذاب کا حکم کافروں پر ثابت ہو گیا'' (محمد جونا گڑھی)
''پر کافروں پر کلمہ عذاب پورا ہو کر رہا'' (امین احسن اصلاحی)

(۱۱) وَكَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ۔ (غافر:6)

''اِسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی اُن سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واصلِ جہنم ہونے والے ہیں'' (سید مودودی)
''اور یونہی تمہارے رب کی بات کافروں پر ثابت ہو چکی ہے کہ وہ دوزخی ہیں'' (احمد رضا خان)
''اور اسی طرح کافروں کے بارے میں بھی تمہارے پروردگار کی بات پوری ہو چکی ہے کہ وہ اہل دوزخ ہیں'' (فتح محمد جالندھری)
''اور اسی طرح تیرے رب کی بات اب لوگوں پر پوری ہو چکی جنھوں نے کفر کیا ہے کہ یہ لوگ دوزخ میں پڑنے والے ہیں'' (امین احسن اصلاحی)
''اور اسی طرح تیرے رب کا فیصلہ ان لوگوں کے سلسلے میں ہو چکا جنھوں نے کفر کیا کہ وہ دوزخی ہیں'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۱۲) لِيُنذِرَ مَن كَانَ حَيّاً وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ۔ (یٰس:70)

''تاکہ وہ ہر اُس شخص کو خبردار کردے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہو جائے''
(سید مودودی)

''اور کافروں پر بات ثابت ہو جائے'' (احمد رضا خان)

''اور کافروں پر بات پوری ہو جائے'' (فتح محمد جالندھری)

''اور کافروں پر حجت ثابت ہو جائے'' (محمد جونا گڈھی)

''اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے'' (امین احسن اصلاحی)

''اور کافروں کے سلسلے میں فیصلہ ہو جائے'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۱۳) وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِم بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنطِقُونَ۔ (النمل:85)

''اوران پر بات پوری ہو جائے گی بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے، پس وہ کچھ نہ بول سکیں گے'' (امین احسن اصلاحی)

''ان پر بات جم جائے گی'' (محمد جونا گڈھی)

''عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا'' (سید مودودی)

''اور بات پڑ چکی ان پر'' (احمد رضا خان)

''اوران کے خلاف فیصلہ ہو گیا'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۱۴) وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ۔ (النمل:82)

''اور جب ان پر بات پوری ہو جائے گی تو ہم ان کے لئے زمین سے کوئی جانور نکال کھڑا کریں گے جو ان کو بتائے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے'' (امین احسن اصلاحی، کوئی جانور نہیں بلکہ ایک جانور کہنا درست ہے)

''اور جب بات ان پر آ پڑے گی'' (احمد رضا خان)

''اور جب ہماری بات پُوری ہونے کا وقت اُن پر آ پہنچے گا'' (سید مودودی)

''اور جب ان کا فیصلہ ہو جائے گا'' (امانت اللہ اصلاحی)

(۱۵) حَتَّى إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ۔ (ھود:40)

''ہم نے اس کو کہا کہ ہر چیز میں سے نر و مادہ دونوں کو اور اپنے اہل وعیال کو، بجز ان کے جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے، اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اس کشتی میں سوار کرلو'' (امین احسن اصلاحی)

''اور جن پر بات پڑ چکی ہے ان کے سوا'' (احمد رضا خان)

''سوائے اُن اشخاص کے جن کی نشان دہی پہلے کی جا چکی ہے'' (سید مودودی)

''جن کے خلاف فیصلہ ہو چکا ہے'' (امانت اللہ اصلاحی)

(١٦) فَاسْلُكْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ۔ (المؤمنون:27)

''تو اس میں ہر چیز کے جوڑے رکھ لو اور اپنے لوگوں کو بھی سوار کرا لو، بجز ان کے جن کے بارے میں قول فیصل ہو چکا ہے'' (امین احسن اصلاحی)

''وہ جن پر بات پہلے پڑ چکی'' (احمد رضا خان)

''جن کے خلاف پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے'' (سید مودودی)

حق القول اور وقع القول ہم معنی الفاظ ہیں، فیروز ابادی کے الفاظ میں: و۔الْأَمْرُ يَحُقُّ ويَحِقُّ حَقَّةً، بالفتح: وجَبَ ووَقَعَ بلا شَكٍّ .(القاموس المحیط)

القول میں معنی کے لحاظ سے بڑی وسعت ہے، بات، وعدہ، حکم اور فیصلہ وغیرہ وہ سب مفہوم اس میں آ سکتے ہیں، جن کا تعلق قول سے ہوتا ہے، ایسی صورت میں سیاق کلام کی مدد سے مناسب مفہوم کا تعین کیا جاتا ہے، مذکورہ بالا تمام آیتوں میں القول اور کلمة سے مراد اگر فیصلہ لیں، تو بات سیاق کلام کے مطابق ہوتی ہے، مفہوم بہت واضح ہو کر سامنے آتا ہے، اور کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ اس صورت میں حق القول کا مطلب ہوگا فیصلہ ہو جانا۔ یہی مطلب وقع القول کا ہوگا، جبکہ سبق القول کا مطلب ہوگا پہلے سے فیصلہ ہو جانا۔

بعض حضرات مذکورہ بالا آیتوں میں قول اور کلمة سے مراد وہ بات لیتے ہیں جو اللہ تعالی نے ابلیس سے کہی تھی۔ لیکن وہ بات تمام مقامات پر فٹ نہیں ہوتی ہے۔ اس کے بجائے یہ بات زیادہ مناسب ہے کہ نافرمانوں کی بدعملی کی پاداش میں اللہ کی طرف سے جو فیصلہ ہوتا ہے، وہ فیصلہ مراد ہے۔

افادات جلیل احسن ندویؒ (۹)

ظفر احمد الاثری، لندن، ای میل:asarizafar@hotmail.com

سورہ الحجر

[اس سورہ میں اس بات کا بیان ہے کہ]توحیداور معاد کے ماننے والوں کے لیے کامیابی ہے اور تکذیب کرنے والوں کے لیے ناکامی ہے۔انذار کا پہلواس سورہ میں بہت سخت ہے۔

[تلک] الر [قرآن]آسمانی کتاب[مبین]اس کامفہوم یہ ہے کہ جواس میں دلائل دیے گئے ہیں سب واضح ہیں،اس لیےاس کے بعد کسی معجزہ کی ضرورت نہیں ہے،آیت حسیہ کا مطالبہ ہو رہا ہے، اس سے پہلے جتنی سورتیں گزری ہیں سب میں آیات حسیہ کا مطالبہ ہو رہا ہے۔اس لیے کہا گیا کہ قرآن سے بڑھ کراور کیا معجزہ ہوسکتا ہے۔

(آیت۱)یہ تمہید ہے۔

(آیت۲)اصل مضمون شروع ہو رہا ہے۔

[رب]اس کامعنی قرینہ سے طے ہوتا ہے

[ما] ملغیہ ہوتا ہے جوعمل کو باطل کر دیتا ہے۔ابہام کے لیے آتا ہے۔

رب رجل کہیں تقلیل وتکثیر کے لیے آتا ہے۔یہاں بہت کے معنی میں ہے،و یتمنون ان یکونوا مسلمین، یہ آخرت میں ہوگا۔(۱)

(آیت۳)اس دنیا میں کیا کر رہے ہیں، وہ اس دنیا میں مگن ہیں، دنیا بھر کی ترقی کے منصوبے بنا رہے ہیں۔

[امل]وہ توقعات اورامیدیں جوانسان اپنے مستقبل کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے باندھتا ہے۔

[فسوف یعلمون] ما لا یعلمون الآن.

(آیت۴)[من قریة] کاذبة ظالمة [کتاب]ایک متعین مدت،اسی طرح ان ظالم مکہ والوں کے لیے ہوگا۔

[من امة] یہ فاعل ہے[من] تعیم کے لیے لگ گیا ہے۔

[لو لا] مضارع پر آتا ہے تو ابھارنے کے معنی دیتا ہے۔

(آیت۷) کیوں نہ فرشتے آ کر بتلا دیتے کہ یہ رسول ہے۔ وہ معجزہ نہیں بھیجے گا، اگر وہ آجائے گا تو مہلت ختم ہو جائے گی۔

(آیت۶۔۱۵) امام فراہیؒ لکھتے ہیں: یہ عبارت تعلیقات میں ہے جسے مولانا جلیل احسن ندویؒ نے درس کے دوران املا کرایا تھا۔

" قالت الکفار للنبی ﷺ انک تزعم ان الله نزل الملائکة الیک بالذکر فهلا تاتی بالملائکة جهرة علینا فنراهم و نؤمن بک. فأجابهم الله تعالی ان الملائکة لا ینزلون الا لحکمه، فنزولهم علی النبی ﷺ لاجل انزال الذکر، ولکم ان تسمعوا هذا الذکر و تنفعوا به والله تعالی هو الذی انزل هذاالذکر و هو یبقیه الی یوم القیامة لتبقی فائدة هذه النبوة الدائمة.(تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم، الجزء الاول الامام عبد الحمید الفراهیؒ)

(آیت۷) بالحق ای بملائکة العذاب (آیت۹) اب معجزہ نہیں دیں گے، معجزہ تھوڑی دیر کے بعد ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ قرآن جو معجزہ بن کر آیا ہے ہمیشہ ہمیش رہے گا۔

(آیت۱۰)[شیع الاولین] فی امم الاولین[رسول] پیغام

(آیت۱۳) جس طرح آج سے پہلے ہمارا ذکر قوموں کے دلوں میں شعلہ پیدا کرتا رہا ہے اسی طرح سے یہ قرآن ان کے دلوں میں شعلہ بن رہا ہے، یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ دھمکی ہے[سنة] روش، سنة الله النافذة فی الاولین، تو ان کی بھی شامت آئی ہوئی ہے۔

(آیت۱۴) وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ کوئی آیت حسیہ پیش کرو تو مومنین کے دلوں میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ شاید آیت حسیہ دکھلانے سے یہ لوگ ایمان لے آئیں گے، تو اسی پر اللہ تعالی کہہ رہا ہے کہ یہ ایمان اس وقت بھی نہیں لا سکتے، جبکہ یہ خود آسمان میں چڑھ جائیں اور اپنی آنکھوں سے ساری چیزیں دیکھ لیں۔

(آیت۱۵) مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہیں آئے گا، یہ قرآن کافی ہے۔

(آیت ۱۶)اگر معجزہ نہیں آئے گا تو پھر کیا آئے گا۔توحید و ربوبیت کے دلائل بھیجے ہیں تو یہ کافی ہیں۔

(آیت ۱۷) نبوت کے اوپر استدلال کرنا ہے۔وہ کہتے تھے کہ جتنی وحی آتی ہے اس میں آمیزش ہے،جب آسمان کی بات چھڑ گئی ہے تو نبوت کے مسئلہ کو رکھ دیا گیا ہے اور یہ بھی تکذیب سے متعلق ہے۔

(آیت ۱۸) احادیث سے معلوم ہوتا ہے وہ بادلوں میں ہوتے ہیں۔(۲)

(آیت ۱۷) اب نگرانی سخت ہوگئی ہے

(۱۹) زمین کو مسطح کر دیا، رہنے کے لیے ہموار کر دیا۔

[موزون]**من کل نبات مقدور** ،کتنے ثمرات آنے چاہئیں،انسانی زندگی اور حیوانی زندگی کے لیے کتنا کافی ہے۔

(آیت ۲۰)[**و من لستم**] اور تمام جانوں کا رزق ہم دیتے ہیں، یہ ربوبیت اور رحمت و رأفت کے پہلو سے آیات سنائی جا رہی ہیں۔

(آیت ۲۱) خازن میں ہوں

[**بـــقـــدر**] یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو تم آیت حسیہ مانگ رہے ہو وہ ہمارے قبضہ قدرت میں ہے لیکن یہ ہمارے لیے فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے ہم نہیں بھیج رہے ہیں۔ یہ اشارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے۔

(آیت ۲۲)[**لواقح**]**حاملة** [**بالسحاب**] ہوائیں بادلوں کو اس طرح تھپیڑے مارتی ہیں کہ اس سے بادلوں کو ولادت ہوتی ہے۔

[**فاسقیناکموہ**] پانی کے خازن تم نہیں ہو وہ تو ہمارے پاس ہے،اور اسی پر تمہارا انحصار ہے۔

(آیت ۲۳) دنیا میں ہر وقت احیاء اور اماتت کا کام ہو رہا ہے، کائنات کے مالک ہم ہیں اور تمہارے شرکاء کچھ بھی نہیں کر سکیں گے،اس میں توحید کی دلیل ہے۔دوسری چیز رأفت و رحمت کی دلیل ہے جو آیت حسیہ کی جگہ پر ہے۔

(آیت ۲۵)[**یحشرھم**] **المستقدمین و المستخرین.**

[**حکیم**]اگر ایسا ہے تو وہ اسی قدر استحقاق دے گا۔**ان کان مستحقا للعقاب فیعقبه و ان کان مستحقا للفضل فیفضله** اور وہ علیم ہے اس لیے وہ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرے گا۔

(آیت ۲۶۔ ۲۸) انسان کو برتری دی گئی ہے اور اس میں مجازات کا پہلو ہے۔ یہ جتنا ہی اونچا اٹھے گا اتنا ہی اوپر جائے گا۔ اور جتنا گرے گا اتنا ہی گرے گا۔

[حـمـا] کالی مٹھی، بتلانا یہ ہے انسان کی پیدائش سڑی گلی مٹی سے ہوئی ہے جس کا جوہر بہت ہی عمدہ ہوتا ہے جو اپنے اندر زرخیزی اور شادابی کے بے شمار جوہر رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی مٹی جس کھیت میں پائی جاتی ہے اس کھیت کی پیداوار لہلہا کر اٹھتی ہے اور فصل نہایت تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے، معلوم یہ ہوا کہ انسان کی تعمیر ایک بہترین جوہر سے ہوئی ہے، پھر دوسری طرف یہ کہ اس کالی مٹی سے عمارت کی بنیاد اٹھائی جاتی ہے تو اس کی تعمیر مضبوط اور ٹھوس ہوتی ہے۔

[سـمـوم] یہ ہمیشہ مہلک ہوتی ہے، اس لیے شیطان کا یہ کہنا کہ ہم آدم سے برتر ہیں تو یہ بالکل غلط ہے۔

(آیت ۲۹) [روح] وہ حکم جو زندگی بن جاتا ہے۔ یہاں پر نمائندہ اول کو خطاب کر کے نوع انسانی کو خطاب کرنا ہے۔

(آیت ۳۱) اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندوں کی فہرست میں ہونے سے انکار کر دیا۔

(آیت ۳۲) **مالک ، أی سبب**

[**لاسجد**] ہرگز، **ان ابیـت بـعـد الـتـذکـر فـاخـرج من هذه المنزلة التی نعطیک [منها]**

(آیت ۳۶) پورے نوع انسانی سے اسے دشمنی ہے۔

[**فانک**] **ان استنظرنی فانک من المنتظرین۔**

(آیت ۳۹) دنیا پرست بناؤں گا۔

(آیت ۴۰) الـذیـن اخـلـصـوا مـنـهـم لکلمة التوحید، مجھ سے بچنے کے لیے تیرا کلمہ اخلاص ہے۔ وہی بچ سکیں گے۔

(آیت ۴۱) هذا۔ عبودیة الاخلاص [علی] مار، مجھ تک پہنچ کا راستہ۔

(آیت ۴۳) وقت مقررہ ہی میں۔

(آیت ۴۴) [سبـــعة] کثرت پر دلالت کر رہا ہے اس لیے کہ معاصی کی راہیں بہت زیادہ ہیں یا سبعة سے مراد سات ہوں اس لیے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ " السبـع الـمـؤبقـات " معاصی کی بنیادی

راہیں مراد ہیں۔(۳)

(آیت۴۴)[جزء]نصیب مقسوم ،یہ ان کا حال ہوگا جو شیطان کے چکر میں ہیں اور جو عبودیت کی راہ اختیار کریں گے وہ اچھے انجام سے ہمکنار ہوں گے۔

(آیت۴۶)[ادخلوها بسلام و آمنین]مسلمین و آمنین من الآفات ،یہ حال واقع ہے۔

(آیت۴۷)[علی سرر] جالسین علی سرر متقابلین، [اخوانا] کی تفسیر ہے۔

اگر ایمان لائے تو بچ جائیں گے ورنہ نہیں بخشے جائیں گے۔ جولوگ اس پر ایمان لائیں گے انھیں بخش دیا جائے گا اور جو ایمان لانے سے اعراض کریں گے وہ خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔ آگے کا قصہ یہی بتلانے کے لیے آیا ہے، کہ ایک قوم نے خدا کی نافرمانی کی تو اس پر عذاب کے تازیانے برسائے، دوسری طرف فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے اسحاق کی خوشخبری دی، وہی فرشتے دو قسم کا پیغام لے کر آئے، ایک کو عذاب کی بشارت دی اور ایک کو خوشی کا پیغام دیا۔ یہی دراصل اس کے غفور اور رحیم ہونے کی علامت ہے۔ جولوگ اس کی بندگی کرتے ہیں انھیں دنیا میں اچھے انجام سے ہمکنار کرتا ہے، اور جو لوگ اس کی نافرمانی پر تل جاتے ہیں تو اللہ تعالی انھیں اسی دنیا میں ان کی سرکشی کا مزہ چکھا دیتا ہے۔

(آیت۶۱) [منکرون] غیر پہچانے جانے والے لوگ ہیں۔ جو اس علاقے کے نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ''منکرون''کا لفظ استعمال کیا ہے۔

(آیت۶۴)[بالحق]عذاب[واتبع] سب کو نکالیں اور خود پیچھے رہیں تا کہ کوئی پیچھے نہ رہ جائے۔

[ولا یلتفت] محبت نہ لاحق ہوجائے۔ اس لیے جلدی سے جاؤ۔

(آیت۶۶)ذالک الأمر المقضی ،وہ یہ ہے کہ انھیں صبح صبح ہوتے ہوئے ان کی جڑ سے کاٹ دیا جائے گا۔

[دابر] کے دوسرے معنی آخری آدمی کے آتے ہیں۔

(آیت۷۰)[او لم ننهک] اپنی حفاظت میں تو لوگوں کو نہ لے، اپنی حفاظت میں لوگوں کو لینے سے پہلے منع کر دیا تھا۔۔تو اب شریف آدمی یہ آخری تیر جو ترکش میں ہے اسے استعمال کرتا ہے۔ یہ

انسانیت کے نام پر ایک اپیل ہے جو انھوں نے اعلان کیا تھا۔

(آیت۷۲) یہ لوگ نہیں مان سکتے ہیں۔

(آیت۷۴) ان کی عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔

(آیت۷۵) اس میں متفکرین کے لیے آیات ہیں۔

(آیت۷۶) [**وانها لبسبیل مقیم**] دائم المرور شاہراہ پر ہیں۔

[**اصحاب الایکه**] مدیانی لوگ۔

[**لبامام مبین**] **الطریق الاعظم**

(آیت۸۰) ثمود نے صالح کا انکار کیا۔

(آیت۸۴) ایسے وقت میں عذاب سے دھمکاتے تو خود مذاق اڑاتے بالآخر زلزلہ آ گیا۔ اور وہ نابود ہو گئے۔ اور تمام تمدنی زندگی ختم ہوگئی۔

(آیت۸۵) یہ خاتمے کی آیتیں ہیں۔

[**بالحق**] **بالعدل**، یوں ہی نہیں ہے، بے مقصد نہیں چل رہا ہے بلکہ ایک مقصد کے ساتھ چل رہا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ جزا کا دن آئے گا۔

[**فاصفح**] ان کے استہزاء اور مذاق سے آپ مشتعل نہ ہوں۔ ان سے درگزر فرمائیں۔

فاصفح الصفح الذی یجمل لمثلک النبی.

(آیت۸۶) وہ قادر بھی ہے اور علیم بھی ہے، جہاں جزا اور سزا کا ذکر ہوتا ہے وہاں یہ دونوں صفتیں اس لیے گنائی جاتی ہیں کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ ایک روز جزا کا دن لائے گا۔ اور جزا کا دن لانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے اعمال سے باخبر ہوتا کہ ان کے اعمال کا بدلہ ٹھیک ٹھیک دے سکے۔ تو اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ جزا وسزا کا دن لائے۔

(آیت۸۷۔۸۸) [**سبعامن المثانی**] **من المکررات**، یہ اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ یہ آیت تسلی کے لیے ہے، اور اس گروپ میں سے ہے، جس میں اہل حق کے غلبہ اور اہل باطل کی شکست کا ذکر ہے۔

اور مثانی سے مراد ''حوامیم''ہیں۔ مؤمنین کو تسلی دی جا رہی کہ قرآن جو عظمت والی کتاب ہے وہ اپنے ماننے والوں کو عظمت سے ہمکنار کرے گا، اور یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اہل

باطل خوب پھل پھول رہے ہیں، اور اہل ایمان کی حالت روز بروز خستگی کی طرف جارہی ہے۔ اس لیے کہا جارہا ہے کہ تم ان سے زیادہ مالدار ہو، تمہیں جو قرآن ملا ہے وہ ان کی دولت اور متاع و مال سے بہتر ہے، اس لیے تم ان کی طرف نگاہ نہ ڈالو، اور سبعًا من المثانی سے تسلی حاصل کرو۔

یہاں حضور سے خطاب کرنا ہے۔ آپ ﷺ ان کے پیچھے زیادہ وقت صرف کرتے تھے اور آپ ﷺ یہ سوچتے تھے کہ اہل باطل کے سردار جو ساز و سامان سے لیس ہیں اگر یہ ایمان لے آئیں تو ان کے جتنے وسائل ہیں سب کے سب اسلام کی راہ میں استعمال ہو جائیں گے اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ مومنین کی تعلیم و تربیت میں اتنا وقت نہیں لگا پا رہے تھے جتنا کہ لگانا چاہیے تھا۔ اور یہ دراصل حرص ہدایت کہ بنا پر کر رہے تھے۔

[واخفض] ان کی تربیت میں پورا پورا وقت صرف کرو۔ کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

(آیت ۸۹) تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تم ایسے ہی کرتے رہے تو عذاب آجائے گا۔

(آیت ۹۱) جس طرح ہم نے یہ کتاب اتاری ہے اسی طرح یہود پر کتاب اتاری تھی۔

(آیت ۹۰) **انا انزلناهذا الكتاب[كما انزلنا فی المقتسمين]** اس سے مراد یہود ہیں جنھوں نے بعض حصے کو چھپا دیا تھا اور تورات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

[عضين] واحد عضة

(آیت ۹۳) اپنی کتاب کے ساتھ کھیلتے رہے، اس میں لکھا تھا کہ ایک نبی آئے گا، جب آجائے گا تو اس کے ساتھ مل کر کام کرنا لیکن وہ مشرکین کے ساتھ مل کر مخالفت کر رہے ہیں۔ اس لیے اے مسلمانو: تم ان یہود کی طرح اپنی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کرنا، اسی لیے ''ف'' فاصدع میں داخل ہے۔

(آیت ۹۴) کھول کر بیان کرتا ہے، توحید و معاد کی باتیں بیان کرتا ہے۔ اور اسی میں انذار ہے، اگر نہیں مانتے ہو عذاب آجائے گا، اگر وہ اشتعال انگیزیاں کریں تو تم مشتعل نہ ہو جاؤ۔

(آیت ۹۵) کفی، مدد کرنا، [**انا كفيناك المستهزئين**] **عاقبة استهزائهم.**

(آیت ۹۸) ''قد'' استمرار پیدا کرتا ہے۔

(آیت ۹۸) ''ضيق صدر'' کا علاج بتلایا جارہا ہے۔

(آیت ۹۹) [واعبد] توحید پر قائم رہو اور اسی کی دعوت دو۔

[يــقيــن] وعدہ نصرت آنے تک، اس کے بعد خود آزاد ہو جائیں گے، نماز میں کوئی رکاوٹ نہیں

ہوگی۔اس وقت نماز پڑھنے میں بہت ساری زحمتیں پیش آ رہی ہیں۔

حواشی:

(۱) تـفـيـد "رب" التكثير ، منه قول النبی ﷺ (رب كاسية فی الدنيا عارية يوم القيامة) كما قد تفيد التقليل ، نحو قول الشاعر:

الا رب مولود و ليس له اب . و ذی ولد لم يلده ابوان

(موسوعه النحو و الصرف و الاعراب : اعداد الدكتوررامثيل بديع يعقوب)

(۲) مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ "وہ شیاطین جو اپنے اولیاء کو غیب کی خبریں لا کر دینے کی کوشش کرتے ہیں، جن کی مدد سے بہت سے کاہن، جوگی، عامل اور فقیر نما بہروپیے غیب دانی کا ڈھونگ رچایا کرتے ہیں ان کے پاس حقیقت میں غیب دانی کے ذرائع بالکل نہیں ہیں۔وہ کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ان کی ساخت انسانوں کی بہ نسبت فرشتوں کی ساخت سے کچھ قریب تر ہے، لیکن فی الواقع ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا ہے"۔(تفہیم القرآن جلد دوم سورہ الحجر حاشیہ ۱۱)

امام بغویؒ نے اپنی تفسیر معالم التنزیل میں اس آیت کی تفسیر احادیث کی روشنی میں اس طرح لکھی ہے، اس سے اس شیطانی عمل کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

"والشهاب ، الشعلة من النار و ذلک ان الشياطين يركب بعضهم بعضا الی السماء الدنيا و يسترقون السمع من الملائكة فيرمون بالكواكب فلا تخطی ابدا فمنهم من تقتله و منهم من تحرق وجهه او جنبه او يده او حيث يشاء الله ومنهم من تخبله فيصير غولا يضل الناس فی البوادی. اخبرنا عبد الواحدبن احمد المليحی انااحمد بن عبد الله بن النعيمی انا محمد بن يوسف ثنا محمد بن اسماعيل ثنا الحميدی ثناسفيان ثنا عمرو قال: سمعت عكرمة، يقول: سمعت ابا هريرة يقول: ان نبی الله ﷺ قال: اذاقضی الله الامر فی السماء ضربت الملائكة باجنهتهاخضعانا لقوله كانه سلسلة علی صفوان فاذا فزع عن قلوبهم قالوا: ماذا قال ربكم؟قالوا: الذی قال الحق و هو العلی الكبير، فيسمعها مسترقو السمع ومسترقوالسمع هكذا بعضهم فوق بعض. ووصف سفيان بكفه فحرفها و بدد بين اصابعه فيسمع احدهم الكلمة فيلقيها الی من تحته ثم يلقيها الآخر الی من تحته حتی

يـلـقيهـا عـلـى لسـان السـاحر او الكاهن فربما ادركها الشهاب قبل ان يلقيها وربما القـاها قبل ان يدركه فيكذب معها مائة كذبة فيقال: اليس قد قال لنا يوم كذا و كذا فيـصـدق بتـلـك الـكـلـمة التـى سـمـعت من السماء. اخبرنا عبد الواحد بن احمد الـمـلـيـحى انا احمد بن عبد الله النعيمى انا محمد بن يوسف ثنا محمد بن اسماعيل حـدثـنا محمد حدثنا ابن مريم ثنا الليث ثنا ابن جعفر عن محمد بن عبد الرحمان عن عـروـة بن الزبير عن عائشة رضى الله عنها زوج النبى ﷺ انها سمعت النبى ﷺ يـقـول: ان الـمـلائـكة تـنـزل فـى الـعنان و هو السحاب فتذكر الامر الذى قضى فى السـمـاء فتستـرق الشيـاطين السمع فتسمعه فتوحى الى الكهان فيكذبون معها مائة كـذبة مـن عـنـد انـفسهـم. واعـلم ان هذا لم يكن ظاهرا قبل مبعث النبى ﷺ و لم يـذكـره شاعر من العرب قبل زمان النبى ﷺ و انما ظهر فى بدء امره و كان ذلك اسـاسـا لـنبـوتـه. وقال يعقوب بن عتبة بن المغيرة بن الاخنس بن شريق: ان اول من فـزع للرمى بالنجوم هذا الحى من ثقيف و انهم جاؤوا الى رجل منهم يقال له عمرو بـن امية احـد بنى علاج و كان اهدى العرب فقالوا له:الم تر ما حدث فى السماء من الـقـذف بالنجوم؟ قال: بلى فانظروا فان كانت معالم النجوم التى يهتدى بها فى البر والبـحـر و تـعـرف بهـا الانـواء من الصيف الشتاء لما يصلح الناس من معايشهم هى التـى يـرمـى بهـا فهى والله طى الدنيا و هلاک الخلق الذين فيها، و ان كانت نجوما غيـرهـا و هى ثابتة على حالها فهذا الامر اراده الله تعالى بهذا الخلق.قال معمر قلت لـلـزهـرى:ا كـان يرمى بالنجوم فى الجاهلية؟ قال: نعم، قلت:افرايت قوله تعالى:.. واخـرجـه البـخـارى ۳۸۰۰ مـن طـريـق الـحميدى به. واخرجه البخارى ٤٧٠١ و ٧٤٨١ و ابوداؤد ۳۹۸۹ و التـرمذى ۳۲۲۳و ابـن مـاجـه ١٩٤و ابـن خـزيـمة فى ((التوحيد))ص ١٤٧ ق ابن حبان ٣٦ و البيهقى ((فى الدلائل)) ٢ - ٢٣٥-٢٣٦ و ابـن مـنده فى ((الايمان)) ٧٠٠مـن طـريـق عـن سـفيـان به. (انا كنا نقعد منها مقاعد للسمع)[الجن؛ ۹]الآية؟ قال : غلظت و شددت امرها حين بعث محمد ﷺو قال ابن قتيبة: ان الرجم كان قبل مبعثه و لكن لم يكن فى شدة الحراسة بعد مبعثه و قيل :

ان النجم ينقض فيرمی الشياطين ثم يعود الی مكانه والله اعلم. ماخوذ من شبكة الآلوكة الشرعية)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں ’’برج کے معنی قلعہ اور محل کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد وہ آسمانی قلعے ہیں جو خدا نے آسمانوں میں بنائے ہیں، جن میں اس کے ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں برابر مأمور رہتی اور دائروں کی نگرانی کرتی ہیں جن سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ شیاطین انس کو ہے اور نہ شیاطین جن کو اور اگر کوئی شیطان ملأ اعلی کی باتوں کی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک قلعہ کی برجیوں پر مأمور سپاہی دشمن کے آدمیوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، کسی اجنبی کو اپنے حدود کے اندر لانگنے کا موقع نہیں دیتے، اسی طرح خدا کے مأمور ملائکہ ان شیاطین جن کو شہاب ثاقب کا نشانہ بناتے ہیں جو ان کے حدود میں ٹوہ لگانے کے لیے دراندازی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ضمناً اس کہانت کی بالکل بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے جس کا عہد جاہلیت میں بڑا رواج تھا اور جس کی آڑ میں کاہن لوگ غیب دانی کے دعوے کر کے سادہ لوح عوام کو بیوقوف بناتے تھے۔ قرآن نے یہ واضح کر دیا کہ ملأ اعلی کے دائروں تک شیاطین کو رسائی حاصل نہیں ہے۔ اگر چہ وہ چوری چھپے کان لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ شہاب کی سنگباری کا ہدف بنتے ہیں۔ اسی پہلو سے یہاں شیطان کی صفت رجیم آئی ہے اس لیے کہ رجیم کے معنی سنگسار کردہ کے ہیں اور لفظ کل اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ بڑے سے بڑا شیطان بھی بہر حال خدا کے محفوظ کیے ہوئے حدود میں داخل نہیں ہوسکتا (تدبر قرآن جلد۴ سورۃ الحجر)‘‘

اس تفسیر سے معلوم ہوا گویا فرشتے شہاب ثاقب کو استعمال کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر کی حدیث میں فرشتوں کے حملے کرنے کا ذکر ہے۔

(۳) (سبع موبقات کی وضاحت نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں کی ہے ”**اجتنبوا السبع الموبقات يعني المهلكات، قلنا: و ما هن يا رسول الله؟ قال: (الشرك بالله، والسحر وقتل النفس التی حرم الله الا بالحق ، اكل الربا، و اكل مال اليتيم ، والتولی يوم الزحف، و قذف المحصنات الغافلات المؤمنات) رواه الشيخان البخاری و مسلم.**

اسلامی معاشرہ

پردیس کی زندگی اور اسلام ......

ابوالاعلی سید سبحانی

فرد مطالبات، حقوق اور تقاضوں کے درمیان رہتا ہے، کچھ دینی مطالبات اور تقاضے ہوتے ہیں اور کچھ سماجی اور اخلاقی۔ کچھ اس کے اپنے حقوق ہوتے ہیں اور کچھ اس پر عائد دوسروں کے حقوق۔ یہی زندگی کا سفر ہے اور اسی سے ہر کسی کا گزر ہوتا ہے۔ کوئی ان راہوں سے ناواقف اور انجان رہتے ہوئے اپنا سفر تمام کرتا ہے اور کوئی ان راہوں سے بھرپور واقفیت اور اس واقفیت کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے اپنا سفر تمام کرتا ہے۔

ایک خوش گوار عائلی زندگی فرد کا حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی، اور اس زندگی میں خوبصورت رنگ بھرنے کے لیے آزادانہ معاشی تگ ودو اخلاقی تقاضا بھی ہے اور سماجی ذمہ داری بھی۔ اسی طرح رب کائنات سے وابستگی کا تقاضا ہے کہ وہ جس عمارت کی بنیادیں اونچی کر رہا ہے، اس کی ایک ایک اینٹ اس وابستگی کی شہادت دے، اور یہ ذمہ داری بہت سی ذمہ داریوں سے بڑھ کر ہے۔

اس سلسلے میں قرآن وحدیث سے مختلف حوالے دیئے جاتے ہیں، مثال کے طور پر:

(وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً۔ الروم:۲۱)

(الرجل راع علی اهل بيته وهو مسئول عن رعيته۔ بخاری، جلد۲، کتاب الاحکام)

(وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقاً نَّحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى۔ طہٰ:۱۳۲)

(يا ايها الذين آمنوا قوا انفسكم واهليكم نارا۔ تحریم:۶)

عائلی زندگی کے تعلق سے عموماً یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک تقاضے کی تکمیل دوسرے تقاضے کی تکمیل سے غافل کردیتی ہے، اور ایک ذمہ داری کی ادائیگی دوسری ذمہ داریوں کے سلسلے میں غفلت کا شکار بنادیتی ہے۔ خاص طور پر معاش کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ فکرمندی یا ترجیحی خلل کے نتیجے میں اہل وعیال کے مختلف سماجی حقوق بھی متأثر ہوتے ہیں اور ان کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں عائد مختلف دینی ذمہ داریاں بھی متأثر ہوتی ہیں۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی مرحوم رقمطراز ہیں:

''اسلام کے نقطہ نظر سے ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ خاص طور پر اپنے بال بچوں اور اپنے قریبی اعزہ اور رشتہ داروں کو دین کے تقاضوں اور اس کے مطالبات سے آگاہ کرتا رہے۔ اسلام کے مطلوبہ طرز حیات میں انسان صرف کمائی کا پرزہ نہیں ہے کہ وہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف معاشی فلاح اور اپنی اور اپنے خاندان کی مالی بہتری کے لیے دن رات ایک کیے رہے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کے راستہ پر چل کر اپنے کو آخرت کی پکڑ سے بچانے میں کامیاب ہوجائے۔ جس کا ناگزیر تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنے اوپر آخرت اور اس کے مطالبات کو مستولی رکھنے کے ساتھ اپنے بال بچوں کو اور اپنے قریبی لوگوں کو برابر آخرت کی پکڑ اور دوسری زندگی کی ضرورتوں سے آگاہ کرتا رہے۔'' (پردیس کی زندگی اور اسلام، صفحہ ۱۵ر)

اسلام کا نظام معاشرت فطرت کے تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے، اس کو فطری نظام معاشرت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظام معاشرت ان انسانی اور اخلاقی اقدار پر قائم ہے جو ہر سماج اور ہر اجتماعیت کے لیے اپنے اندر موزونیت رکھتے ہیں۔ اس نظام کے تحت فیملی کا جو نقشہ بنتا ہے، اس میں مرد کا رول اہم ہوتا ہے اور وہ اس میں اپنی موجودگی کو یقینی بناتے ہوئے رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بحیثیت شوہر بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے، بحیثیت باپ اولاد کے حقوق ادا کرتا ہے اور بحیثیت قوام اور راعی گھر کی تمام ذمہ داریوں کو ادا کرتا ہے، وہ گھر کے ماحول کو خوش گوار اور اس کے رنگ کو خوبصورت بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس نقشہ سے وہ دوری بہت مشکل سے اور بہت ہی وقتی طور پر برداشت کرتا ہے، اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ اس نقشے میں اسے خود رنگ بھرنا ہوگا، دور رہ کر محض وسائل کی فراہمی اس میں اپنی پسند کے رنگ بھرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی اس چیز کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے، لکھتے ہیں:

''اسلام بندگیٔ رب کے جس وسیع تصور کا قائل ہے۔ اس میں دینی زندگی کے دوسرے بہت سے

تقاضے بھی ہیں اور ان تمام دینی تقاضوں کی متوازن اور ہم آہنگ ادائیگی پر ہی ایک مسلمان کی دنیا وآخرت کی فلاح وکامرانی کا دارومدار ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ روزی روٹی کے لیے گھر بار سے دوری اور پردیس کی زندگی اسلام کے نقطۂ نظر سے قابل ستائش اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ وہ دوسرے دینی تقاضوں کی ادائیگی کے ساتھ ہو۔ اس پس منظر میں اسلام کے مطالبات کا تقاضا ہے کہ مرد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہے اور عام حالات میں اگر اس کی گھر سے دوری بھی ہو تو مختصر وقفوں کے لیے ہو جس سے یہ تقاضے مجروح نہ ہوں۔ پردیس کی یہ صورت کہ آدمی دو دو چار چار، بلکہ آٹھ آٹھ دس دس سال کے طویل وقفوں کے لیے بال بچوں سے دور اکیلا اور تنہا پڑا رہے اور زندگی کے آخری ایام تک کے لیے یہی چیز اس کا معمول بن جائے، اسلام اپنی معاشرت کا جو مخصوص نقشہ رکھتا ہے اور اس نسبت سے خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے مرد سے اس کے جو مطالبات ہیں اور اس پر وہ جو ذمہ داریاں عائد کرتا ہے، پردیس کی یہ صورت اس کی پوری معاشرتی اسکیم کو درہم برہم کر دیتی ہے اور اس کا پورا نقشہ کا رالٹ کر رہ جاتا ہے۔'' (صفحہ ۳۲/۳۳)

مولانا سلطان احمد اصلاحی مرحوم نے وقت کے اہم ترین سماجی مسائل پر قلم اٹھایا ہے، یہ مولانا کی تحریروں کی ایک اہم امتیازی خوبی ہے۔ اسلام کا تصور مساوات، بچوں کی مزدوری اور اسلام، بندھوا مزدوری اور اسلام، جنسی تعلیم کا مسئلہ اور اسلام، پردیس کی زندگی اور اسلام، کم سنی کی شادی اور اسلام، مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام، اسلام کا نظریہ جنس، مسلمان اقلیتوں کا مطلوبہ کردار، آزادی فکر ونظر اور اسلام، اسلام اور آزادی فکر وعمل۔۔۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے سماجی موضوعات ہیں جن پر مولانا نے قلم اٹھایا اور خوب جم کر لکھا، بلکہ مختلف ایسے موضوعات پر مولانا نے کتابیں تصنیف کیں، جن موضوعات پر اردو زبان میں مولانا سے پہلے اسلامی نقطہ نظر سے کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ ان موضوعات میں ایک اہم موضوع، سماجی اور عائلی زندگی کا ایک بڑا مسئلہ'' تنہا پردیس کی زندگی'' کا ہے، مولانا نے ''پردیس کی زندگی اور اسلام'' کے عنوان سے ۸۷ صفحات پر مشتمل ایک کتاب ۱۹۹۰ء کے قریب لکھی، جو دسمبر ۱۹۹۰ء میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی سے پہلی بار طبع ہوکر منظر عام پر آئی۔

مختلف ضرورتوں، بالخصوص معاشی ضرورت کے تحت پردیس کا سفر کرنا اور وہیں سکونت پذیر ہوجانا، انسانی دنیا کی قدیم روایت رہی ہے۔ قدیم زمانے میں بالخصوص تجارت کی غرض سے لوگ قافلوں کی شکل میں مہینے دو مہینے اور کبھی کبھی اور زیادہ مدت کے لیے مختلف دور دراز کے علاقوں کا سفر

کرتے تھے۔لیکن موجودہ دور میں بالخصوص صنعتی انقلاب کے بعد، جبکہ زندگی کے ہر شعبے میں بالخصوص طرزِ معاشرت میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہوئیں، معاشی ضرورتوں میں اضافہ ہوا، کسب معاش کے نئے نئے مواقع اور نئے نئے وسائل وذرائع متعارف ہوئے، اس دوران پردیس کی طرف ہجرت کی رفتار میں بھی غیر معمولی تیزی آئی، اور پھر اس سے متعلق مسائل میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، یہ مسائل فرد سے متعلق بھی تھے، اس کے گھر خاندان سے متعلق بھی تھے اور پھر عام سماج سے متعلق بھی تھے۔

پردیس کی طرف ہجرت اپنے آپ میں نہ تو کوئی مسئلہ ہے اور نہ کوئی معیوب بات، بلکہ مختلف صورتوں میں اس کو مستحسن بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔اصل مسئلہ پردیس کی طرف ہجرت کے نتیجے میں انسانی زندگی کو منفی طور پر متأثر کرنے والی صورتوں کا ہے، اس ضمن میں خاص طور پر جو مسئلہ فکرمندی کا طالب ہے وہ ''گھر خاندان کو چھوڑ کر تنہا پردیس کی زندگی اختیار کرنے'' کا ہے، اور یہ وہ مسئلہ ہے جس سے بلاتفریق مذہب وملت عام انسانی سماج، بالخصوص سماج کا کمزور یا متوسط طبقہ بڑی حد تک متأثر ہے۔اس کتاب میں اسی پہلو سے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔چنانچہ موضوع کا تعارف کراتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''ہندوستانی سماج کے مسائل کی اگر کوئی مختصر سے مختصر فہرست بھی بنائی جائے تو ''پردیس کی زندگی'' کو اس میں سرفہرست مقام حاصل ہوگا۔ ہندوستان بلکہ تیسری دنیا کا یہ وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس سے ہر گھر اور ہر خاندان کا واسطہ ہے۔اپنے اہل وعیال سے طویل وقفوں کی مستقل جدائی نے برصغیر کے چپے چپے اور اس کے ذرے ذرے کو ایسے کرب سے آشنا کیا ہے کہ اس سرزمین کے ہر بن مو سے اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ کرب انگیزی ہندوستان کے نغمہ اور اس کی موسیقی کا ناگزیر جزو بن گئی ہے۔جس نے واقعہ ہے کہ نغموں کی دنیا میں اسے ایک بالکل ہی نئے اور منفرد رنگ اور آہنگ سے آشنا کیا ہے۔ بے شمار افراد اور بے شمار بچھڑے ہوئے خاندانوں کا یہ وہ بڑا سہارا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنا غم غلط کرتے اور صبح کی شام کرتے ہیں۔ ہندوستان کے خاص معاشی حالات اور مخصوص معاشرتی پس منظر میں ''پردیس کی زندگی'' ایک ایسی تسلیم شدہ اور مانوس حقیقت ہے جس کے سلسلے میں مزید غور وفکر کرنے اور ذہن کو تھکانے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔لیکن اسلام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہم کو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اسلام پردیس کی زندگی کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے مطلوبہ معاشرتی نقشہ سے یہ چیز کس قدر ہم آہنگ ہے۔کہاں تک یہ اس کے لیے قابل قبول ہے۔اور کس مرحلہ پر پردیس کی زندگی اس کے لیے ناقابل تسلیم بن جاتی ہے۔(صفحہ ۵/۶)

مولانا نے اس موضوع پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے، وہ اس کے پس منظر کا بھی ہر طرح سے احاطہ کرتے ہیں اور پھر اس کے اثرات اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے سماجی نقصانات کا بھی ہر پہلو سے جائزہ لیتے ہیں۔ یہ مولانا کی تحریروں کی دوسری بڑی خوبی ہے، موضوع کا ہر پہلو سے احاطہ کرنے کی کوشش۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے یہاں غور وفکر اور جستجو کا عمل کس قدر مضبوط اور توانا تھا۔ یہ پہلو میدان علم وتحقیق میں قدم رکھنے والے ہم نو واردین کے لیے کافی اہم اور عملی رہنمائی کرنے والا ہے۔ مولانا ''تنہا پردیس کی زندگی'' کے معاشی اور معاشرتی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہندوستان بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک رہا ہے۔ آج بھی اس کی آبادی کی عظیم اکثریت شہروں اور قصبوں کے بجائے دیہاتوں میں رہتی ہے۔ پھر ہندوطرز معاشرت کے غلبہ کے باعث مشترک خاندانی نظام یہاں کے معاشرتی نظام کا بڑا مقدس اور ناگزیر جزو رہا ہے۔ ان دوگونہ معاشی اور معاشرتی عوامل کے نتیجے میں ''پردیس کی زندگی'' خاص طور پر ہندوستان کی دیہی آبادی کا لازمی حصہ قرار پائی۔ زراعتی گھرانوں کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے کچھ افراد گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کا کام سنبھالیں تو دوسرے افراد پردیس کا رُخ کر کے نقد رقم کے ذریعہ خاندان کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں معاون ہوں۔'' (صفحہ ۶)

معاشرتی پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں: ''ہندوستانی آبادی پر ہندوطرز معاشرت کی چھاپ بہت گہری ہے۔ مسلمان قوم پر بھی اس کے قابل لحاظ اثرات صاف طور پر موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ترجیحات اور اسلام کے مطلوبہ رویہ کو نظر انداز کر کے مسلمان قوم بھی اغیار کی طرح پردیس کی زندگی کی ویسی ہی بلکہ بسا اوقات اس سے کچھ زیادہ ہی رسیا ہے۔ انسانی نفسیات کی مجبوریوں اور کمزوریوں سے آگے اپنے دین اور اس کے تقاضوں کی نسبت سے اس زندگی کے اختیار کرنے میں اسے شاید ہی کبھی کسی سوچ اور کسی الجھن کا احساس ہوتا ہے۔''

آگے معاشی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک بڑی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں: ''معاشی مسائل اور معاشی مجبوریوں کی بڑی اہمیت ہے اور اس میں شک نہیں کہ مسلمان آبادی کی عظیم غریب اکثریت کے لیے زندگی کی ناگزیر ضروریات پوری کرنے کی خاص طور پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس سے بہتر اور آسان دوسری سبیل نظر نہیں آتی کہ وہ پردیس کو اپنی قسمت سمجھ کر اپنے کو اس کے حوالہ کردے۔'' لیکن اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ایک اور حقیقت کی جانب متوجہ کرتے ہوئے

بہت ہی دلسوزی کے ساتھ لکھتے ہیں: ''لیکن اس سے ہٹ کر ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں جہاں ضرورت سے زیادہ بے جا ٹھاٹ باٹ اور نا مطلوب روایتی ٹیپ ٹاپ اور آن بان کو باقی رکھنے کے لیے بال بچوں سے دور زندگی بھر کے بن باس، کو پوری طیب خاطر سے گوارا کیا جاتا ہے اور دین اور اس کے تقاضوں سے ذہن میں کبھی کوئی خلش اور اضطراب نہیں پیدا ہوتا ہے۔'' (صفحہ ۷/۸)

مولانا نے اس کتاب میں تنہا پردیس کی زندگی کے نقصانات کا ہر پہلو سے احاطہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے، نفسیاتی نقصانات، عائلی نقصانات، دینی و اخلاقی نقصانات، معاشی نقصانات، سماجی وملی نقصانات، وغیرہ۔ مولانا کی تحریر میں حقائق کی نشاندہی بھی ہے، حالات پر تلخ تبصرے بھی ہیں، اور ترغیب و تذکیر کا پہلو بھی ہے۔ مسئلہ کے نفسیاتی پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''دن اور رات میں کام کے اوقات کے بعد اس کی اہم ترین نفسیاتی ضرورت ہے کہ اس کا کچھ وقت اپنے بیوی بچوں اور بے تکلف دوست اور احباب کے ساتھ گزرے۔ ضرورت کے تقاضے سے ہفتے دو ہفتے یا مہینے دو مہینے کے لیے اس معمول میں خلل آجائے تو چنداں ہرج نہیں کہ اس کے بغیر زندگی کی گاڑی کا چلنا مشکل ہے، البتہ طویل وقفوں کے لیے اس سے مسلسل محرومی اس کی شخصیت کو غیر معمولی طور پر متأثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ ناخواندہ اور جاہل افراد جن کے احساسات عام طور پر جانوروں سے قریب تر ہوتے ہیں، اگر وہ اس مصیبت کو محسوس کیے بغیر، اپنے زندگی کے دن پورے بھی کر لے جائیں تو سمجھ دار، پڑھے لکھے اور باشعور انسانوں کے لیے یہ وہ بھاری بوجھ ہے جسے وہ آسانی کے ساتھ نہیں اٹھا سکتے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ناخواندہ اور ان پڑھ افراد بھی اپنے کو اس مصیبت کے اثرات سے بچانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔'' (صفحہ ۱۲/)

اس سماجی مسئلہ کے اول درجہ کے متأثرین، یعنی شوہر اور بیوی کے حالات اور ضروریات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''گھر بار سے مسلسل دوری کی اس زندگی میں بیوی نہیں شوہر بھی اسی طرح مظلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ایک مسلمان کے نقطہ نظر سے شوہر اور بیوی دونوں ہی ایک ایسی صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں جس سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز ان کے لیے فی الحقیقت تشویش انگیز نہیں ہو سکتی۔ اور وہ یہ کہ ایک دوسرے سے دور رہنے کے باعث زندگی کے طویل ترین عرصے میں وہ دونوں اپنی طرف سے حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کے اندیشے میں گھرے ہوتے ہیں۔ جنس (Sex) کے معاملہ میں اسلام جیسا کچھ حساس ہے معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے جو اس نے اپنے نظام زندگی میں بھرپور

جنسی زندگی کی سہولت بہم پہنچائی ہے اوراس کے لیے کشادہ راہوں کی نشاندہی کی ہے۔اس کے ساتھ ہی رشتہ ازدواج سے باہر جنسی تعلق اس کے نزدیک اتنا ہی مبغوض ہے۔اور ایسے مجرموں کے لیے اس نے سخت ترین سزائیں تجویز کی ہیں۔جنس کے معاملے میں اسلام کی اسی فکرمندی کا مظہر ہے جو بلوغت کے بعد کسی بڑی رکاوٹ کے بغیر وہ جلد شادیاں کردینے کو پسند کرتا ہے۔'' (صفحہ۱۵/)

مسئلہ کا یہ پہلو مولانا کے نزدیک اپنے اندر سب سے زیادہ سنگینی رکھتا ہے، چنانچہ وہ عام مسلمانوں، دین دار طبقوں اور علماء کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عقلیں ایسی اوندھی ہوئی ہیں کہ اس صورتحال کو کمی اور کمزوری تسلیم کرکے اس کے ازالہ کے لیے فکرمند ہونے کے بجائے اس پردیس پر فخر کیا جاتا ہے۔اور جو گھر اپنے جتنے زیادہ مردوں سے محروم ہے گردوپیش میں اس کی بڑائی کے چرچے بھی اسی قدر بڑھے ہوئے ہیں۔ عام مسلمان ہی نہیں ان کا روایتی دین دار طبقہ یہاں تک کہ علماء کرام بھی اس صورتحال پر ایسے ہی مگن ہیں۔وعظ وتذکیر کی کسی مجلس میں اس کی طرف توجہ مبذول کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے۔'' (صفحہ۱۴/)

اس کا دوسرا بڑا منفی اثر بچوں پر پڑتا ہے، مولانا کے بقول: ''طویل وقفوں کی پردیس کی مسلسل زندگی خاص طور سے اسلام کے نقطہ نظر سے تربیت اولاد کی اس اسکیم کو بالکل خاک میں ملادیتی ہے۔'' (صفحہ۱۸/) آگے اس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ: ''یک رخی معاشی خوشحالی کی چکاچوند میں ہوسکتا ہے خاندان کو اس پہلو سے اپنی محرومی اور ناداری کا احساس نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ باپ کے ہوتے ہوئے اس کی عدم موجودگی میں اولاد کی اٹھان خودرو پودے کی اٹھان ہے جو اتفاق کے نتیجے میں شجر سایہ دار وثمر دار بھی ہوسکتا ہے۔ ورنہ عام حالات میں اکثر وبیشتر اس کا جھاڑ جھنکار کی صورت میں نمودار ہونا یقینی ہے۔'' (صفحہ۱۸/)

اس کے نتیجے میں ان کے اندر جو بڑی معاشرتی خرابیاں درآتی ہیں، ان میں سرفہرست ''نمائشی زندگی'' ہے، اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اپنوں ہی نہیں بسااوقات اغیار میں بھی رشک ورقابت کے جذبات کو پروان چڑھانے کے علاوہ یہ نمائشی طریقہ زندگی طبیعتوں میں جو سطحیت اور اتھلاپن پیدا کرتا ہے، بامقصد، حساس اور صاحب شعور کسی بھی جماعت کے لیے یہ چیز بڑی توجہ طلب ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ ایسے پردیسیوں کی اولاد میں محنت مشقت سے گریز، تساہلی، کام چوری، تعلیم سے محرومی، ٹھوس کاموں سے گھبراہٹ وغیرہ کی جو متعدد بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں اور جن کا سلسلہ نسل بعد نسل

مسلسل آگے کو بڑھتا رہتا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس میں خاصا بڑا دخل اس مصنوعی اور نمائشی زندگی کا ہے تو غالباً کچھ بہت زیادہ غلط نہ ہوگا۔'' (صفحہ ۲۳ر)

اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت اور صحیح اٹھان پر توجہ مولانا کے ہاں کس قدر اہمیت کی حامل ہے، اس کا اندازہ ذیل کی عبارتوں سے ہوگا:

''اگر یہ صحیح تربیت اور صحیح نگرانی کے ذریعہ دین ودنیا کے کام کی بن کر ماں باپ کی نگاہوں کی ٹھنڈک بن سکے تو زندگی میں اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی دوسری کامیابی نہیں۔ اگر اولاد ناکارہ اور بے راہ ہو جائے تو حساس والدین کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی صدمہ نہیں جو زندہ رہ کر بھی تادم آخر انہیں موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا رکھے۔ ناخواندہ، جاہل، روح دین سے بے بہرہ، بے حس والدین کے لیے ہوسکتا ہے، مختصر مدتی (Short Term) معاشی چکاچوند میں اس طرح کی کسی کشمکش کا سامنا نہ ہو لیکن دین آشنا اور حساس والدین کے لیے وہ صدمہ ہے جوان کی ہڈیاں کھلا دینے والا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ کی پوری نگرانی اور نگہداشت کے باوجود بھی اولاد بگڑ جاتی اور بے راہ ہو جاتی ہے لیکن بہرحال اس صورت میں آدمی کو عنداللہ وعندالناس یہ کہنے کے لیے اطمینان رہتا ہے کہ اس نے اپنے بس بھر تو تربیت وتعلیم میں کوئی کمی نہ رکھی۔ آگے اگر قسمت ہی کا نہ لکھا ہو تو اس کا کیا کیا جاسکتا ہے؟ (صفحہ ۲۰ر)

نفسیاتی اور عائلی نقصانات کے بعد مولانا معاشی نقصانات پر گفتگو کرتے ہیں، مولانا جہاں تنہا پردیس کی زندگی کے معاشی نقصانات اور اس کے آنے والی نسلوں پر ممکنہ اثرات پر گفتگو کرتے ہیں، وہیں ایسے حالات میں فرد کی معاشی پالیسی کیا ہو، اور کن خطوط پر اس کو کام کرنا چاہیے اس کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

''انسان کی یہ کمزوری بھی ہے کہ وہ اپنی روایات اور گردوپیش کے حالات سے غیر معمولی طور پر متأثر ہوتا ہے۔ چنانچہ بیرون ملک کا پردیس جس گھر کی روایت بن جائے اس میں اندرون ملک کی کمائی اور اس سے حاصل ہونے والے اسبابِ زندگی نگاہوں کو بہت کم جچتے ہیں۔'' (صفحہ ۲۵ر)

''اشیائے ضرورت کے کاروبار جن میں سرمایہ لگانے کے ساتھ آدمی کو محنت اور جدوجہد بھی سخت کرنی پڑتی ہے اور دراصل یہی کاروبار ہیں جو مضبوط معیشت کی بنیاد ہیں، ایسے پردیس کے علاقے کے لوگ ان میں ہاتھ لگانے کی ہمت کم ہی کر پاتے ہیں۔ پردیسیوں کی آل اولاد کے لیے تو یہ چیز اور بھی مشکل ہوتی ہے۔'' (صفحہ ۲۸ر)

''مضبوط معاشی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے پاس قابل اعتماد مستقل معاشی ذرائع

ہوں۔ زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، ملازمت آدمی کا جو بھی ذریعہ معیشت ہو، مستقل ہو، اور وہ پورے انہماک اور پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہوا ہو۔ جس کے نتیجے میں یک طرفہ طور پر صرف پیسہ خرچ نہ ہو رہا ہو بلکہ آمد وصرف دونوں کا سلسلہ پورے توازن کے ساتھ قائم ہو۔ ایک طرف اگر تیزی سے پیسہ خرچ ہو رہا ہو تو دوسری طرف اسی تیزی سے پیسہ پیدا بھی ہو رہا ہو۔ صرف خرچ کرنے کے رجحان کی حامل بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرنے والی پردیس کی زندگی معاشی استحکام کی اس صحیح ترتیب کو بالکل الٹ دیتی ہے جہاں پیسہ پیدا کرنے کی صورتوں پر ذہن لگانے کے بجائے صرف پیسہ خرچ کرنے کی نت نئی صورتیں نکالنے پر پوری دماغی قوت صرف ہوتی ہے۔'' (صفحہ ۲۴)

موضوع کا مزید احاطہ کرتے ہوئے مولانا آخر میں اسے ''ہندوستان کے مخصوص حالات کا تقاضا'' بھی قرار دیتے ہیں۔ مولانا کے الفاظ میں: ''میرٹھ اور ملیانہ کے تازہ واقعات نے بتادیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنے گھروں کو تنہا چھوڑ کر باہر رہنے کا کوئی موقعہ نہیں ہے بلکہ گھر پر رہ کر بھی انہیں صرف کمائی کی مشین بن کر نہیں رہنا ہے۔ بلکہ خاندان کی جان ومال اور اس کی عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے اس سے آگے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ حق وانصاف کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اگر انہیں یک طرفہ طور پر دہشت وبربریت کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس سلسلے میں اپنے مذہب کی تعلیمات اور اسلام کے عاید کردہ حدود وآداب کی رعایت کرتے ہوئے، وقت پڑنے پر اپنی جان پر کھیل جانا ان کی اولین ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف پیسوں کی ریل پیل کے لیے اگر آبادیاں مردوں سے بالکل خالی ہوں، جیسا کہ بعض علاقوں میں مسلمانوں کی نسبت سے اس کا عام رواج ہے، تو نازک مواقع پر خاندان کی حفاظت ودفاع کے لیے نہتے بچے اور عورتیں اور بوڑھے لوگ کچھ کرنا بھی چاہیں تو کیا کر سکتے ہیں۔ اس پہلو سے آج مسلمانوں کے لیے اندرون ملک پردیس بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی ان کے لیے مسلسل سوچ اور فکرمندی کا ہے کہ وہ معیشت کے ایسے ذرائع پیدا کریں جس میں خاندان بن سرا ہو کر نہ رہے اور روزی روٹی کے حصول کے ساتھ تا بہ حد امکاں گھر کی عزت وآبرو کی حفاظت کا بھی سامان رہے۔'' (صفحہ ۲۹/۳۰)

ان تمام نقصانات پر گفتگو کرنے کے باوجود مولانا ملک کے زمینی حالات اور پردیس میں رہنے والوں کی مجبوریوں کا اعتراف کرتے ہیں، چنانچہ وہ ایک درمیانی راستہ نکالتے ہوئے عملی نوعیت کا ایک مشورہ پیش کرتے ہیں: ''تنہا پردیس کے ان صریحی نقصانات کا تقاضا ہے کہ ایک مسلمان کو اس سے زیادہ

سے زیادہ بچنے اور دور رہنے کی ضرورت ہے۔ مجبور کن حالات میں اس کے سوا چارۂ کار نہ ہو تو اسے بالکل عبوری اور ہنگامی حالات کا درجہ دینا چاہیے۔ اور کمال احتیاط سے اس کی اضافی آمدنی سے اندرون ملک روزی روٹی کا ذریعہ پیدا کر کے اس سے جلدی سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ ایک مسلمان جسے اپنی ہمہ جہتی دینی ذمہ داریوں کا احساس ہو وہ تنہا پردیس کی اس زندگی پر کبھی قانع اور مطمئن نہیں ہوسکتا۔ دین و دنیا کے ان نقصانات سے بچنے کے لیے۔۔۔۔ وہ اسے انتہائی مجبور کن حالات میں آخری چارہ کے طور پر بالکل وقتی اور ہنگامی صورت میں ہی اختیار کرسکتا ہے۔'' (صفحہ ۳۰)

اسی کتاب میں دوسری جگہ باہمی رضامندی اور حالات کی تبدیلی کی کوششوں کے ساتھ مشروط کرتے ہوئے تنہا پردیس کی زندگی کی گنجائش نکالتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اضطراری حالات میں روزی روٹی کی تلاش میں چار چھ ماہ سے زائد کے تنہا پردیس کے لیے کم سے کم بات ہے کہ طرفین کی باہمی رضامندی اور مفاہمت اور اس کا عہد و پیمان اور یقین کامل ہو کہ وہ جدائی کے اس وقفے کو عفت مآبی اور پاکبازی کے ساتھ گزاریں گے۔ اور آخری حد تک کفایت شعاری محتاط روی اور بہترین منصوبہ بندی کے ذریعہ اس اضطراری کیفیت سے جلد سے جلد نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔'' (صفحہ ۸۳)

اس ضمن میں معاشرہ اور حکومت کی ذمہ داریوں کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں: ''ذاتی محنت اور ذاتی جدوجہد کے ساتھ معاشرہ اور حکومت کو بھی اس کی طرف پوری قوت سے متوجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرنے میں زیادہ سے زیادہ مددگار اور معاون ہو کہ تنہا پردیس کو زندگی کا معمول بنانے کے بجائے لوگوں کے لیے اپنے اہل وعیال کے درمیان رہتے ہوئے روزی روٹی کے حصول کی سہولت میسر ہوسکے۔ ملک و قوم کے مفاد میں ان کا وطن سے دور رہنا ضروری ہو تو انہیں آسانیاں فراہم کی جائیں کہ وہ جہاں کہیں رہیں اپنے اہل وعیال کو اپنے ساتھ رکھیں۔ تنہا پردیس کی صورت میں بیوی برہ کی آگ میں جلنے کے لیے مجبور نہ ہو''۔ (صفحہ ۸۳)

کتاب کا دوسرا بڑا حصہ استدلال پر مشتمل ہے۔ استدلال کے سلسلے میں بھی مولانا کی یہ خوبی بہت نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہے کہ وہ موضوع سے متعلق ہر ممکن دلیل پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ اس کتاب میں بھی قرآن وحدیث اور فقہی و عقلی دلائل کے ذریعہ ہر طرح سے اپنی رائے کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

استدلال کو مولانا نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور اس کو مختلف عنوانات اور پھر ذیلی عنوانات

میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے نمبر پر وہ ''مرد کی ذمہ داریوں'' کے عنوان سے تین ذیلی عناوین کے تحت اپنا استدلال پیش کرتے ہیں: (۱) مرد کی قوامیت (۲) مرد نگراں ہے (۳) تربیت اہل وعیال۔ مذکورہ عناوین کے تحت وہ قرآنی آیات، احادیث رسولؐ اور عقلی دلائل سے استدلال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کھلی ہوئی بات ہے کہ پردیس کی زندگی میں جبکہ باپ کا اولاد سے واسطہ برائے نام اور واجبی سا رہتا ہے، وہ ان کے تئیں اس اخلاقی ذمہ داری کو ادا نہیں کرسکتا۔ اور یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کو اپنی روزی روٹی کے سلسلے میں ایسی صورتوں کے لیے فکرمند ہونا چاہیے جن میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہ سکے تاکہ ان کی معاشی اور مالی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ، ان کے سلسلے میں اپنی دینی اور اخلاقی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہو سکے۔'' (صفحہ ۴۸/)

آگے لکھتے ہیں: ''اس تمام تفصیل کا اقتضاء ہے کہ مرد کو اپنے بیوی بچوں کے سلسلے میں صرف ان کی معاشی اور مالی ذمہ داریوں کا لحاظ رکھنا کافی نہیں ہے۔ اہل وعیال کی نسبت سے اس کی اہم ترین ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے ادب واخلاق اور ان کی دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے۔ اور انہیں فرائض دین اور واجبات دین کا پابند بنانے کی صورتیں اختیار کرے۔ مرد اپنے بیوی بچوں کے سلسلے میں ان دوگونہ ذمہ داریوں سے اسی وقت عہدہ برآ ہوسکتا ہے، جبکہ وہ انہیں اپنے ساتھ رکھے اور ان کے اوپر اس کی کڑی نگرانی برابر قائم رہے۔ آدمی بیوی بچوں سے ہزاروں میل کی دوری پر رہے اور صرف خاندان کی مالی ضروریات فراہم کرتا رہے، اس صورت میں استثنائی طور پر تو کوئی خاندان دیندار، باادب اور بااخلاق ہوسکتا ہے، لیکن پنچانوے فی صدی حالات میں اس کی توقع مشکل سے ہی کی جاسکتی ہے۔'' (صفحہ ۵۰/)

استدلال کے دوسرے حصے میں مولانا ''قرآن وسنت کے دیگر مطالبات جن سے مرد کا بیوی بچوں کے ساتھ رہنا ثابت ہوتا ہے'' کے عنوان کے تحت بھی تین ذیلی عناوین قائم کرتے ہیں: (۱) انذار اقربین (۲) اہل وعیال کو نماز کا حکم (۳) کھانا بیوی بچوں کے ساتھ کھایا جائے۔ پہلے اور دوسرے حصے کے استدلال میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا، البتہ ذیلی عنوان ''کھانا بیوی بچوں کے ساتھ کھایا جائے'' کافی اہم معلوم ہوتا ہے، اس کے ضمن میں احادیث پاک کو بیان کرتے ہوئے کافی اہم اور ذہن کو اپیل کرنے والی بات لکھتے ہیں: ''کھلی ہوئی بات ہے کہ بیوی کے منہ میں لقمہ آدمی سات سمندر پار سے نہیں تھما سکتا۔ ہندوستان کے عام دستور سے بھی ہٹ کر جس میں کہ شوہر بیوی کا ایک ساتھ کھانا کھانا معیوب سمجھا جاتا ہے، بلکہ قدیم مسلمان وضعدار گھرانوں میں اس کا شائد تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ

مشترک خاندان میں کوئی بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ بے تکلف ہوکر ایک دسترخوان پر کھانے کی جرأت کر سکے۔ مشترک خاندانی نظام کے غیر اسلامی طرز معاشرت سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل اسی وقت کیا جاسکتا ہے جبکہ طویل وقفوں کے تنہا پردیس کے بجائے مسلمان مرد اپنی بیوی کے ساتھ رہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھائے اور دسترخوان کی ہر چیز سے اس کی لذت کام و دہن کا سامان کرے۔'' (صفحہ۶۳/)

استدلال کے تیسرے حصہ کا عنوان ہے ''حضرات انبیاء علیہم السلام کا نمونہ'' اس میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر گفتگو ہے، جس سے ازدواجی زندگی سے متعلق انبیاء کرام علیہم السلام کا اسوہ معلوم ہوتا ہے۔ ان سے مولانا نے جو استدلال کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے: ''اسلام کے صحیفہ ہدایت، قرآن، میں ان حضرات گرامی کی دعوتی جدوجہد کے ساتھ ان کی ذاتی اور شخصی زندگی کے نمونے بھی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ جو اسلام کے نقطہ نظر سے پردیس کی زندگی کے مسئلہ زیر بحث کے سلسلے میں اپنے اندر پوری رہنمائی کا سامان رکھتے ہیں۔ اور ان سب کا خلاصہ یہی ہے کہ بال بچوں سے دور پردیس میں تنہا مستقل طور پر پڑے رہنے کے بجائے آدمی کو اپنی روزی روٹی کے لیے ایسی راہیں پیدا کرنی چاہئیں جن سے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہوئے ضروریات زندگی کا سامان کیا جاسکے۔ (صفحہ۶۵/۶۶/)

پردیس کی زندگی کے مسئلہ پر انبیاء کرام علیہم السلام کے اسوہ سے مولانا کا استدلال محل نظر ہے۔ اس پر کافی غور وخوض کے بعد ناچیز اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ استدلال پیش کیا جاسکتا ہے کہ خوش گوار ازدواجی زندگی کے سلسلے میں ہمیں انبیاء کرام علیہم السلام کے اسوہ کی پیروی کرنی چاہیے۔

استدلال کے چوتھے حصے کا عنوان ہے ''ایلاء کی بحث''۔ اس کے تحت مولانا ایلاء کے مسئلہ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ایلاء کی اس بحث سے بھی صاف واضح ہے کہ پردیس کی ایسی زندگی جس میں شوہر بیوی کو تنہا چھوڑ کر چار چھ ماہ کے لیے نہیں بلکہ سال سال دو دو سال بلکہ بسا اوقات اس سے آگے چار چار آٹھ آٹھ اور دس دس سال کے لیے سینکڑوں ہزاروں میل دور پڑا رہے، اسلام کے معاشرتی نظام کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ جس کی وہ کسی صورت تائید نہیں کرسکتا اور جو اس کے لیے کسی صورت قابل قبول نہیں۔'' (صفحہ۷۹/۸۰/)

استدلال کے پانچویں حصے کا عنوان ہے''بیوی کا حق تحصین''، اس عنوان کے تحت گفتگو کرتے ہوئے مولانا نے''احصان'' کے اوپر اچھی گفتگو کی ہے، لکھتے ہیں:''احصان، حصن سے نکلا ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں۔ رشتۂ ازدواج کے مقصود کی تعبیر کے لیے اس لفظ کے استعمال کا مطلب ہے کہ ذاتی عفت و پاکدامنی اور خاندانی وجاہت وشرافت کے علاوہ عورت اور مرد کو جنسی بے راہ روی سے اصل تحفظ اسی رشتہ نکاح کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ نکاح کے اس مقصود کا حصول اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ شادی کے بعد شوہر و بیوی معمول کے طور پر ساتھ ساتھ رہیں۔ طویل طویل وقفوں کے لیے تنہا پردیس کو زندگی کا معمول بنا کر نکاح کے اس مقصد عظیم کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔''(صفحہ ۸۱)

کتاب کے آخر میں مولانا نے خلاصہ کلام کے تحت اس پوری بحث کا خلاصہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''اس تمام تر گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان مرد جو خدا اور رسولؐ کے ساتھ بے لاگ وفاداری میں زندگی بسر کرنے کا آرزومند ہو، اس کے لیے کسی صورت جائز نہیں ہوسکتا کہ بال بچوں سے دور کئی کئی سال کے تنہا پردیس کو وہ زندگی کا معمول بنالے۔ اسلام اپنی مطلوبہ معاشرت کے نقشے میں خاندان کے سربراہ کی حیثیت میں اپنے بیوی بچوں کی نسبت سے مرد کی جو ہمہ جہتی و ہمہ پہلو ذمہ داریاں قرار دیتا ہے، ان کی ادائیگی اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ تنہا پردیس کے بجائے وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ رہنے کو زندگی کا معمول قرار دے، اس میں شک نہیں کہ اپنی ذاتی ضروریات کے علاوہ ملک وقوم اور معاشرے اور تمدن کی ضرورت سے آدمی کو گھر سے قدم باہر نکالنے ہی پڑتے ہیں۔ لیکن اپنے اہل وعیال کی نسبت سے مرد کی ان ذمہ داریوں کا تقاضا ہے کہ اِن وقفوں کو کبھی کبھار (Csual) اور بہت ہی مختصر اور ناقابل لحاظ ہونا چاہیے۔ خاندان میں مسلمان مرد کی ہمہ جہت ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ معمول کے طور پر اس کے صبح وشام اپنے اہل وعیال کے ساتھ بسر ہوں۔ دن بھر روزی روٹی کی تلاش میں وہ گھر سے باہر رہے تو شام کو بال بچوں میں واپس ضرور آجائے۔ اس کے آگے اگر گھر سے دوری ہو تو اتفاقیہ اور مختصر اور ناقابل لحاظ وقفے کے لیے ہو جس سے اہل وعیال کے دوسرے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ان کے اوپر سے اس کا دینی اور اخلاقی دباؤ متأثر نہ ہونے پائے۔ اور گھر کے نگراں 'قوام' اور نگہبان 'راعی' کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اس کے لیے کوئی خلل واقع نہ ہو۔''(۸۳/۸۴)

(یہ مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقد''مولانا سلطان اصلاحیؒ سیمینار۔ حیات اور علمی وفکری جہات'' بتاریخ ۲۳/۲۴ ستمبر ۲۰۱۷ء میں پیش کیا گیا۔)

اظہار رائے کی اخلاقیات

رضوان احمد فلاحی، لندن
rizwanfalahi@hotmail.com

اسلوب کلام کی شائستگی اور نرمی خوشگوار ماحول میں مباحثے کو مثبت انداز سے آگے لے جاتی ہے اور نقطہ ہائے اتفاق بیدا ہونے کے امکانات زیادہ روشن ہوجاتے ہیں۔

''میں اپنی رائے پر سختی سے قائم ہوں، تاہم تمہارا حق اختلاف بھی مجھے تسلیم ہے۔'' معلوم نہیں یہ کس دانا کا قول ہے، لیکن جس کا بھی ہو، بات اپنی جگہ کھری ہے۔ امام شافعیؒ نے تو اس سے بڑھ کر بات کہی ہے:

''میری رائے درست ہے اور میرے حریف کی غلط، تاہم اس کے صحیح ہونے کا بھی احتمال ہے۔ میرے حریف کی رائے غلط ہے اور میری درست، تاہم اس کے غلط ہونے کا بھی امکان ہے۔''

مذکورہ بالا دونوں اقوال بتاتے ہیں کہ رائے کے اظہار کا صحتمندانہ طریق کیا ہونا چاہیے اور یہ کہ کسی مباحثے کو کس طرح خوشوار فضا میں مزید آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور یہ کہ حریف کے حق اختلاف اور اس کے موقف کی صحت کے امکان کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے تسلیم شدہ موقف کو نئی جہتوں سے آشنا کیا جا سکتا ہے۔ صحتمندانہ مباحثوں کی مثال بہتے ہوئے پانی کی سی ہے۔ پانی جب تک بہتا رہتا ہے اس کی تازگی برقرار رہتی ہے۔ اگر اسے روک دیا جائے اور وہ جمع ہونے لگے تو کچھ عرصہ کے بعد اس میں تعفن کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ مباحثے جمود کا شکار ہونے لگتے ہیں تو ان میں ہٹ دھرمی کا تعفن پیدا ہونا

لازمی ہے۔

تعقل وتفکر کی صلاحیتیں بہترین عطیہ الٰہی ہیں۔اس نعمت کا کوئی بدل نہیں۔ ہر سوچنے والا ذہن قدرے مختلف انداز سے سوچتا ہے کہ اس کی انفرادیت اسی کی متقاضی ہے۔ یہاں مجھے لندن یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے ایک اشتہار کی عبارت یاد آئی۔اشتہار کی عبارت صرف اتنی تھی:

''دو سوچنے والے ذہن الگ الگ انداز سے سوچتے ہیں۔'' مختصر لیکن کیا ہی بلیغ عبارت ہے۔

واقعہ یہی ہے کہ سوچنے والے اذہان مختلف پیرائے اور انداز سے سوچتے اور اپنے نتائج فکر پیش کرتے ہیں۔نتائج میں اختلاف اور تنوع مزید غور وفکر کے نئے آفاق وا کرتا ہے اور یوں بہتر سے بہتر موقف تک پہنچنے اور انہیں اپنانے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔فکر وفہم کے دائرے میں وسعت آتی ہے جس کے نتیجے میں دلوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور نقطہ ہائے نظر میں اختلاف کے باوجود معاشرہ میں وسعت اور تحمل کے مظاہر نمو پاتے ہیں۔

اسلام نے رایوں کے بے لاگ اظہار پر کوئی قدغن نہیں لگائی ہے۔ بلکہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بے لاگ اور منصفانہ رایوں کا اظہار امانت ہے ہے اور امانتوں کی ادائیگی قرآنی حکم ہے (النساء: ۵۸)۔نیز امانت میں خیانت ایک سنگین جرم ہے جس سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے (الانفال: ۲۷)۔ رایوں کے اظہار میں کن ضوابط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اسلامی تعلیمات کا تتبع کرنے سے چند بنیادی اور اصولی نوعیت کے ضوابط ہمارے سامنے آتے ہیں جنہیں مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱- اس باب میں پہلا ضابطہ یہ ہے کہ اس حقیقت کا ادارک ہونا چاہیے کہ فکر وفہم کا تنوع اور اختلاف ایک فطری امر ہے۔اسی طرح صلاحیتوں کا اختلاف بھی فطری چیز ہے۔ضروری نہیں کہ میں جس نہج پر سوچ رہا ہوں میرا مدمقابل بھی اسی نہج پر سوچے۔اگر وہ کسی معاملے میں کمتر انداز سے اپنی رائے کا اظہار کرسکتا ہے تو کسی دوسرے معاملے میں اظہار کا بہتر انداز بھی اختیار کرسکتا ہے۔

۲- اس بات کا پورا امکان ہے کہ ایک ہی واقعہ کو دو افراد اپنے اپنے انداز سے دیکھیں اور اور نتیجہ نکالیں اور دونوں اپنی جگہ بالکل درست ہوں۔مثلاً ایک گلاس پانی سے آدھا بھرا ہے۔ایک شخص نے کہا گلاس آدھا بھرا ہے۔دوسرے نے کہا گلاس آدھا خالی ہے۔نتیجے کے اعتبار سے دونوں اپنی جگہ درست ہیں،صرف انداز کا اختلاف ہے۔

۳- دوسروں کی رائے پر تنقید میں مدمقابل کی عزت نفس اور اس کی عرفی حیثیت ووقار کا خیال

رکھنا اور نیت کونشانہ نہ بنانا ضروری امر ہے۔مباحثوں میں اس اخلاقی ضابطہ کا لحاظ رکھنا پل صراط سے گزرنا ہے۔اورکم ہی لوگ کامیابی سے اس مرحلے سے گزر پاتے ہیں۔صحتمند مباحثوں کا مقصد حریف کو بہر حال زیر کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ زیر مباحثہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کوحتی الامکان زیادہ سے زیادہ منقح کرنا مقصود ہوتا ہے۔اس ضمن میں مدمقابل کی رائے رآراءبھی تنقید کا نشانہ بنتی ہیں۔تنقید علمی اور دلائل سے مزین ہو۔ذراسی بے احتیاطی اور حد سے تجاوز سے تنقید کوتنقیص میں بدلتے دیر نہیں لگتی جس کے بعد مباحثوں کا پورا ماحول بدل جاتا ہے اورکوئی بھی فریق صحیح اورمعقول بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا ہے۔

۴-اپنی رائے کا اظہار ہو یا مدمقابل کی رائے پر تنقید، ہر دو حالتوں میں محرک یہ ہو کہ مقصود صحیح موقف قبول کرنا حق ہے خواہ اس کا اظہار حریف کی جانب سے ہی کیوں نہ ہو۔اس کی مثال کچھ اس طرح سے ہے کہ گویا کسی کی کوئی چیز کھوگئی ہے۔وہ اسے تلاش کرتا ہے اس کے ساتھی بھی تلاش کرر ہے ہیں۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تلاش کے دوران گمشدہ چیز اصل مالک کوملتی ہے یا اس کے کسی ساتھی کو۔

۵- عدل وانصاف کا رویہ اختیار کرنا۔دین اسلام کی بنیادوں میں عدل اس کی core بنیاد ہے۔عدل کا مطلب صاحب حق کو اس کا حق بغیر کسی کمی کے دینا، یہ حق مادی بھی ہوسکتا ہے اور معنوی بھی۔ارشادالٰہی ہے:

’’وَإِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوا وَلَو كَانَ ذَا قُرۡبىٰ،وَبِعَهۡدِ اللّٰهِ أَوۡفُوا، ذٰلِكُمۡ وَصّٰكُمۡ بِهِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُونَ‘‘ (الانعام:۱۵۲)

(اور جب تم بات کروتو انصاف کرو گو وہ شخص قرابت دار ہی کیوں نہ ہواور اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو،اس کا اللہ نے تمھیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یادرکھو)۔

ایک دوسری آیت ملاحظہ ہو جس میں یہی حکم دوسرے انداز سے اورمزید صراحت کے ساتھ دیا گیا ہے:

’’يٰـأَيُّهَا الَّذِيۡنَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالۡقِسۡطِ، وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَآنُ قَومٍ عَلىٰ أَنۡ لَا تَعۡدِلُوا، إِعۡدِلُوا، هُوَ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوىٰ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، إِنَّ اللّٰه خَبِيۡرٌ بِمَا تَعۡمَلُونَ۔‘‘(المائدۃ:۸)

(اے ایمان والو،تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہوجاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے

بن جاؤ، کسی قوم کی عداوت تمہیں عدل کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ کرے، عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، یقین مانو کہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔)

وہی معاشرہ صحیح معنوں میں انسانی معاشرہ کہلانے کا حقدار ہے جس میں عدل کا بول بالا ہو اور انصاف برتنے میں من وتو کی تمیز نہ برتی جائے۔ دشمن سے دشمنی اپنی جگہ، لیکن اگر انصاف برتنے میں ترازو کا پلڑا اس کی طرف جھک رہا ہو تو اسے اس کا یہ حق بہرحال ملنا چاہیے۔ عدل گستری تقویٰ کے قریب تر ہے، وہ تقویٰ جو تمام نیکیوں کا شیرازہ (ملاك الحسنات) ہے۔

مباحثوں میں حریف کے ساتھ انصاف کی مندرجہ ذیل شکلیں ہوسکتی ہیں:

- اس کے علم کا اعتراف کیا جائے۔
- اس کی صحیح اور مدلل بات تسلیم کی جائے۔
- اس کی بات کا وہ مطلب نہ نکالا جائے جو اس میں نہ پایا جاتا ہو۔
- اس کی بات سے جو مطلب نکلتا ہو اس پر اپنی جانب سے کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔

۶- حریف کی رائے پر اپنی رائے دینے سے قبل اس کی رائے اور متعلقہ موضوع سے متعلق اگر اس کی دیگر تحریریں بھی ہوں، تو ان کے مکمل استقراء کے بعد ہی اپنی رائے کا اظہار کیا جائے۔ پورا امکان ہے کہ کسی جگہ اس کی کوئی مجمل تحریر غلط فہمی کا باعث بن سکتی ہو لیکن دوسری جگہ اس نے شرح وبسط کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی اس طریق پر کی ہو کہ غلط فہمی کا شائبہ باقی نہ رہے۔

۷- کسی کی رائے پر اپنی رائے کے اظہار میں واسطہ مجرد رائے سے ہونا چاہیے، اس سے تجاوز کرکے صاحب رائے کی طرف جانے کی ضرورت نہیں تاکہ اس اقدام سے ہمارے نقطۂ نظر پر غیر ضروری مثبت یا منفی اثر واقع نہ ہو۔ یعنی قائل اگر مخالف ہو تو محض اس کا مخالف ہونا ہمیں اس کی صحیح بات تسلیم کرنے سے نہ روکے اور اگر قائل قدر ومنزلت والا ہو تو محض اس سے خوش عقیدگی کی بنیاد پر اس کی غلطیوں سے صرف نظر کر لیا جائے۔ یہ رویہ عدل وانصاف کے اصولوں کے خلاف ہے۔

۸- گفتگو اور بحث کے دوران شائستگی اور وقار برقرار رکھنا از بسکہ ضروری ہے۔ کسی کی بات کی تردید کا ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ فوری طور پر درشت لب ولہجے میں کہہ دیا جائے: تم بالکل غلط کہہ رہے ہو۔ تمہاری بات ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ میرا اور اپنا وقت فضول میں ضائع کر دیا، وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مدمقابل کی بات پورے اطمینان سے سنی جائے اور اس سے اختلاف کا اظہار اس انداز سے کیا

جائے: تمہارا نقطہ نظر سامنے آیا۔ اس میں مجھے کئی جگہ جھول دکھائی دے رہے ہیں۔ یا یہ کہ تم نے جس انداز سے مسئلے پر نظر ڈالی ہے اسے دوسرے انداز سے بھی دیکھا جا سکتا اور مختلف نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ تمہارے دلائل سامنے آئے، اب میرے دلائل پر بھی غور کر لو۔ تمہاری بات کے بعض اجزاء سے اتفاق کرتے ہوئے بعض دیگر اجزاء سے مجھے اختلاف ہے جس کے یہ اور یہ دلائل ہیں۔ اسلوب کلام کی شائستگی اور نرمی خوشگوار ماحول میں مباحثے کو مثبت انداز سے آگے لے جاتی ہے اور نقطہ ہائے اتفاق پیدا ہونے کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔

اور اخیر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کو حرز جاں بنا لیا جائے تو عمومی طور پر بہت سی پیچیدگیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے:

''آپس میں حسد نہ کرو، ایک دوسرے کی کھوج کرید میں نہ پڑو، ایک دوسرے کے خلاف بغض وعداوت کے جذبات نہ رکھو، ایک دوسرے کے خلاف سازش نہ کرو--- اللہ کے بندو، بھائی بن کے رہو--- مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس پر نہ وہ ظلم کرے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑے، نہ جھٹلائے نہ اس کی تحقیر کرے--- ایک مسلمان کے لیے اس کے مسلمان بھائی کا خون بہانا، مال پر قبضہ کر لینا اور ناموس بے توقیر کرنا (مطلقاً) حرام ہے۔ (مسلم)

خطبہ حجۃ الوداع کی عصری معنویت

جوہر جاوید گیاوی،موبائیل نمبر:08409640946

حقوق انسانی کا نظریہ انسانوں کے ان حقوق اور شخصی آزادی سے بحث کرتا ہے جن حقوق وآزادی کے تمام انسان بحثیت انسان یکساں طور پر مستحق ہیں۔حقوق انسانی کی رو سے سارے انسانوں کو بلاامتیاز بنیادی ضروریات وسہولیات کی تکمیل اوران سے فائدہ اٹھانے کا حق پہنچتا ہے۔تاریخی اعتبار سے اس نظریہ کے پس پردہ کارفرما محرک کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف دور جدید کا ہی امتیاز نہیں ہے بلکہ انسان اپنی معلوم تاریخ میں ابتداء سے ہی ان حقوق کا سزاوار سمجھا جاتا رہا ہے،اور ہر دور میں جو بھی سہولیات اور وسائل میسر رہے ہوں ان سے مستفیض بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ حقوق انسانی کا مسلمہ ومتفقہ نظریہ کسی دستور یا دستاویز کا محتاج نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق عمومی اخلاقیات سے تھا۔

دور جدید میں حقوق انسانی کے تصور کو جنگ عظیم کے بعد کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ان حقوق کی نشاندہی کی وجوہات میں ایک وجہ کثیر تعداد میں انسانی جان کا تلف ہونا تھا۔۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے مشاورت سے حقوق انسانی کا آفاقی منشور Universal declaration of Human Right مرتب کیا۔ جان لاکر، روسو،سنیٹ تھامس، الیکوناس، کانٹ اور والٹیر وغیرہ فلسفیوں اور مفکرین نے حقوق انسانی کو اپنی فکر کا مرکز بنایا۔حقوق انسانی پر چند قدرتی تشریحات یونانی فلسفیوں کی تصانیف میں بھی ملتی ہیں۔انسانی حقوق کے دائرے میں شہری وسیاسی دونوں طرح کے حقوق شامل ہیں۔زندگی کا حق،آزادی کا حق،جائیداد وملکیت کا حق،اظہار رائے کا حق اس میں بنیادی طور پر شامل ہیں۔

تاریخی اعتبار سے حقوق انسانی کا تصور سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں واضح ہوسکا ہے۔مگر اس سے ہزاروں سال قبل جناب محمد عربیؐ نے اس کی داغ بیل اپنے حجۃ الوداع کے خطبے میں ڈال دی تھی۔آپؐ نے اپنے اس طویل خطبے میں ان تمام انسانی حقوق کو شمار کرایا تھا جنہیں آج حقوق انسانی کے

آفاقی منشور میں شمار کرایا جاتا ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع:

بلاشبہہ نبی اکرمؐ کے سر اس کا سہرہ بندھتا ہے کہ آپؐ نے حقوق انسانی کی بیداری کا اعلان حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔ آپؐ نے مدینہ منورہ میں ایک آزاد، پرامن اور روح حریت کے حامل معاشرے کی بنا رکھی۔ آپ نے وقت کی ظالم و جابر حکومتوں کے تختے الٹ دیے۔ جن کا طرۂ امتیاز انسانی حقوق کا استحصال اور ان کی جانوں پر استبداد تھا۔ آپؐ کی رہبری میں جو ریاست افق عالم پر قائم ہوئی وہ حقوق انسانی کی اولین محافظ اور علمبردار تھی۔ جہاں بلاامتیاز رنگ و نسل، قوم و مذہب، خطہ و جغرافیہ سب کو یکساں حقوق حاصل تھے۔ اس ریاست کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ سماج کا جو کمزور ترین گروہ تھا اس کے حقوق کے تحفظ کے لیے اتنی ہی فکرمندی تھی۔ آپؐ کے اولین جانشین حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے پر جو پہلا خطبہ دیا تھا اس میں آپؓ نے فرمایا تھا:

أیھا الناس ألا اِنّ أقواکم عندی الضعیف حتی آخذ الحق منه و أضعفکم عندی القوی حتی آخذ الحق له. (تاریخ طبری)

اے لوگو! سنو تمہارا سب سے مضبوط آدمی مری نگاہ میں کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے حق وصول نہ کرلوں اور تم میں کا سب سے کمزور انسان میری نگاہ میں مضبوط ہے جب تک کہ میں اس کے لیے حق وصول نہ کرلوں۔

آپؓ نے نہ صرف حقوق انسانی کی فہرست بندی کی بلکہ اس کی پاسبانی کے لیے ایسے مضبوط انتظامات کیے کہ لوگوں کو کسی کا حق پامال کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور جو کوئی ایسا کرتا تھا وہ قانونی دسترس سے بچ نہیں پاتا تھا۔

آپؐ نے اپنے خطبہ کی ابتدا میں ہی لوگوں کو خدا کا واسطہ دیا اور اس سے ڈرنے کی تلقین کی۔ حقوق انسانی کی عظمت کا احساس دلایا۔ کسی بھی طرح کے بیرونی عوامل سے زیادہ جس بات پر زور دیا وہ یہ تھی کہ:

یا أیھاالناس! اتقوا اللہ، أوصیکم بتقوی اللہ۔

لوگو!! میں تمہیں خدا ترسی کی تلقین کرتا ہوں۔ اللہ کی پکڑ سے ڈرو اور انسانی حقوق کے نگہبان بن جاؤ۔ اسے پامال کرنا خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ اس سے بچو۔

مساوات نوع انسانی:

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر محسن انسانیتؐ نے ایک لاکھ چوالیس ہزار صحابہ کرامؓ کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو گواہ بنا کر اعلان فرمایا:

یا أیها الناس! ألا ان ربکم واحد، وان اباکم واحد، ألا لا فضل لعربی علی أعجمی ولا لأعجمی علی عربی. ولا لأحمر علی أسود، ولا لأسود علی أحمر الا بالتقوی، أبلغت؟ قالوا: بلغ رسول الله۔ (مسند احمد ۲۳۸۸۵)

اے لوگو! سن لو تمہارا پروردگار ایک ہے۔ اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار کسی عربی کو کسی غیر عربی پر اور کسی غیر عربی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی برتری حاصل ہے۔ سوائے تقوی کی بنیاد پر۔

اس کے علاوہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

کلکم من آدم و آدم من تراب۔ (الخطب والوصایا بحوالہ تاریخ طبری)

تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔

طلوع اسلام سے قبل عرب معاشرے میں مختلف قسم کے امتیازات پائے جاتے تھے۔ نسلی امتیازات، سماجی امتیازات، طبقاتی امتیازات اور ان امتیازات کی بنیاد پر لوگ ٹکڑوں اور گھروندوں میں تقسیم تھے۔ کوئی بڑے اور معزز قبیلے کا ہوتا تو اسے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا، سماج میں اسے اعلی مقام ملتا، اس کی رائے قابل قبول ہوتی اور اگر کوئی چھوٹے قبیلے کا ہوتا اور معاشی وسماجی لحاظ سے کمزور ہوتا تو اسے سماج میں کوئی عزت نہ تھی۔ رؤساء وصنادید کمزور طبقے کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو باندی بنا لیتے۔ عرب معاشرہ ایک ایسا معاشرہ تھا جہاں بھید بھاؤ اور اونچ نیچ کا بول بالا تھا۔

نبی آخرالزماںؐ کا نوع انسانی پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ آپؐ نے اپنی آفاقی تعلیمات کے ذریعہ طبقوں اور گروہوں میں بٹی اس دنیا کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیا۔ اور ہر قسم کے امتیازات وتعصّبات کی دیوار منہدم کر کے تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا ہم پلہ بنا دیا۔

حسب ونسب، رنگ ونسل، زبان وجنس، مال ودولت، خطہ وجغرافیہ کی بنیاد پر کوئی باعزت یا رذیل نہیں ہے۔ امیر وغریب، عورت ومرد، راجہ و پرجا، سیاہ وسفید کوئی بھی ہو اور وہ دنیا کے کسی بھی علاقے یا خطے میں رہتا ہو سب برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں۔ قانون کی نگاہ میں سب

برابر، کوئی بھی کسی امتیازی شان کا مستحق نہیں۔ ہاں خداترسی کی بنیاد پر۔ آپؐ نے فضیلت وشرف کی جو کسوٹی متعین کی وہ خوف خدااور خداترسی ہے۔ عقل ودانش بھی اسی طرف رہنمائی کرتی جبکہ شرف کا معیار ایسی چیز کو ہونا چاہیے جو تمام انسانوں کے قبضے میں ہو۔ اور جس کے مواقع یکساں طور پر سب کو حاصل ہوں۔ ایسی چیز کو معیار فضیلت ہرگز نہیں ہونا چاہیے جو انسان کی دسترس سے باہر ہو۔ کوئی انسان کس خاندان، کس خطہ زمین اور کس رنگ ونسل میں پیدا ہوگا اس کا فیصلہ وہ کیسے کرسکتا ہے۔ یہ تو انسانی قدرت سے باہر کی چیز ہے۔ مگر تقوی اور خداترسی ایسی چیز ہے جس کے حصول کے مواقع یکساں طور پر سب کو حاصل ہیں۔ بندے کا معاملہ براہ راست خدا سے ہے۔ وہ اللہ سے اپنے رشتے کو جتنا مضبوط کرے گا اتنا ہی وہ اللہ کی نظر میں معزز اور باعزت ہوگا۔

اس مساوات انسانی کے عالم گیر پیغام کے ذریعہ آپؐ نے انسانیت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کی شیرازہ بندی کی اور تقسیم در تقسیم ہوچکی اس انسانیت کو اتحاد کا درس دیا۔ اور عالمی مساوات کی بنا رکھی۔

حقوق انسانی

روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو ایک آدم کی اولاد قرار دینے کے بعد آپؐ نے انسانوں کے حقوق کا اعلان فرمایا۔ اس کے لیے آپؐ نے ایک نہایت دل نشیں اور بلیغ انداز اختیار فرمایا۔ آپؐ نے پہلے صحابہ کرامؓ کے جم غفیر سے سوال کیا:

أی یوم هذا؟ یہ کون سا دن ہے؟

صحابہ کرامؓ کے انبوہ کثیر نے جواب دیا: حرام۔

پھر آپؐ نے پوچھا:

أی شهر هذا؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟

جاں نثار صحابہؓ کی جماعت نے عرض کیا: **شهر حرام**۔ حرمت والا مہینہ ہے۔

پھر آپؐ نے پوچھا:

أی بلد هذا؟ یہ کون سا شہر ہے؟

صحابہ کرامؓ کے مجمع عظیم نے فرمایا: **بلد حرام**۔ یہ حرمت والا شہر مکہ ہے۔

جب لوگ پوری طرح آپؐ کی طرف یکسو ہوگئے تو زبان رسالت سے وہ ارشادات نکلے جنہیں آئندہ حقوق انسانی کا عالمی منشور بننا تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

فان اللہ قدحرم بينكم دمائكم واموالكم واعراضكم كحرمة يومكم هذا،في شهركم هذا، في بلدكم هذا، أ بلغت؟قالوا: بلغ رسول الله. قال: فليبلغ الشاهد الغائب۔(مسند احمد ۲۳۸۸۵)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے خون، تمہارے اموال، اور تمہاری عزتوں کو اس دن، اس ماہ اور اس شہر کی طرح ہی حرام کر دیا ہے۔ اے بندگانِ خدا، کیا میں نے خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیا؟ سب نے ایک زبان ہو کر کہا: ہاں! اللہ کے رسولؐ نے ہم تک خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: جو یہاں حاضر ہیں وہ غیر حاضر تک میرا یہ پیغام پہنچا دیں۔

پھر آپؐ نے مجمع سے خطاب کر کے پوچھا: کیا میں نے پہنچا دیا۔ لوگوں نے جواب دیا: ہاں اللہ کے رسول آپ نے پہنچا دیا۔ پھر آپؐ نے امت پر تبلیغ کی عظیم ذمہ داری ڈالتے ہوئے فرمایا: جو یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں کو پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔

آپؐ کی تعلیمات یہ ہے کہ روئے ارضی پر بسنے والے ہر بشر کو زندہ رہنے، جائیداد رکھنے اور عزت نفس کے ساتھ زندگی گزارنے کا پورا حق ملنا چاہیے۔ کسی انسان یا حکومت یا اتھارٹی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی انسان کو اس کے ان حقوق سے محروم کر دے۔

آپؐ کے سوالیہ انداز اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اہل عرب کے نزدیک زمانہ قدیم سے یوم النحر، شہر ذی الحجہ اور شہر مکہ کی حرمت وعظمت متفق علیہ تھی۔ اس میں وہ چوری ڈاکہ، راہ زنی، قتل و غارت گری سب کچھ چھوڑ دیتے تھے جو کہ ان کا روز کا مشغلہ تھا۔ آپؐ نے پہلے ان کے نزدیک حرام اور محترم چیزوں کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ جس طرح تم قربانی کے دن، ذی الحجہ کے مہینے اور مکہ شہر کی حرمت کے قائل ہو اب تمہاری جانیں، تمہاری جائیداد اور تمہاری عزت وآبرو بھی ایسے ہی حرام کر دی گئی ہیں۔ لہٰذا اب کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی کا ناحق خون بہائے۔ کسی کی دولت اور جائیدادوں پر ڈاکہ ڈالے۔ اور کسی کی عزت وعصمت سے کھلواڑ کرے۔ آج سے یہ ساری چیزیں حرام کر دی گئیں۔

نبی محترمؐ کی اس بلیغ نصیحت کا صحیح معنوں میں ادراک تبھی ہوگا جب ہم ظہور اسلام کے وقت عربوں کی اخلاقی حالت کا نقشہ اپنے ذہن میں تازہ رکھیں۔ رہزنی اور لوٹ مار عرب معاشرے کا جزو لاینفک تھی۔ کسی کی جان و مال محفوظ نہ تھی۔ ڈاکہ اور رہزنی ان کا ذریعہ معاش اور محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے لیے باضابطہ گروہ ہوتے تھے جو جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے ہوتے۔ جب بھی کوئی قافلہ ادھر سے

گزرتا، اسے لوٹ لیتے، حدتو یہ ہے کہ ان کی نظر میں یہ عیب کی باتیں نہ تھیں بلکہ اسے وہ فخر اور بہادری کا کام سمجھتے تھے۔ رات دن کی خانہ جنگی، لوٹ مار اور کشت وخون کے نتیجے میں انسانی جان کا کوئی احترام ان کی نظر میں نہ تھا۔ انسانوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ اور سفاکانہ برتاؤ کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مدتوں برسرپیکار رہتے اور ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے۔

ایسے ماضی کے حاملین عربوں کے درمیان یہ اعلان کہ اب سے تمہاری جانیں، جائیدادیں اور عزت و ناموس محترم قرار پائیں، ان کی حرمت کا خیال رکھو، بہت انقلابی اعلان تھا۔ اس اعلان کے ذریعہ آپؐ نے انسانی جانوں کا نرخ اونچا کردیا۔ اس طرح آپؐ نے سارے انسانوں کی جان و مال اور عزت وآبرو کی حرمت کا اعلان فرما کر عالمی امن کے قیام کا اعلان فرمایا۔

اس کے بعد آپؐ نے بہت تاکید کے ساتھ فرمایا:

ألا كل شيء من أمر الجاهلية تحت قدمي موضوع۔ مسلم۲۹۵۰

خبردار سن لو! جاہلیت کی تمام چیزیں میرے قدموں تلے روند ڈالی گئیں۔

اب جاہلیت کے ایام کی کسی چیز کا کوئی مطالبہ نہ ہوگا۔ آپؐ نے اپنے خاندان کے عامر بن ربیعہ بن حارث کے خون کے مطالبہ کو کالعدم قرار دیتے ہوئے فرمایا:

ودماء الجاهلية موضوع۔

ایام جاہلیت کے خون کا اب کوئی مطالبہ نہیں، سب معاف ہے۔

خواتین کے حقوق:

مساوات انسانی اور حقوق انسانی کے بعد آپؐ نے سماج کے کمزور طبقے کے حقوق کا اعلان فرمایا: ان میں خواتین کے حقوق کا علان فرماتے ہوئے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

واتقوا الله في النساء، فانكم أخذ تموهن بامان الله، واستحللتم فروجهن بكلمة الله. ولكم عليهن أن لايوطئن فرشكم أحداً تكرهونه. فان فعلن ذلک فاضربوهن ضربا غير مبرح. ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف۔ (مسلم:۲۹۵۰)

لوگو! عورتوں کے متعلق اللہ سے ڈرو، تم نے انہیں اللہ کی امانت کے طور پر اور اس کے کلمہ کو گواہ بنا کر اپنی زوجیت میں لیا ہے۔ تمہارا ان پر حق یہ ہے کہ وہ کسی ایسے کو جنہیں تم ناپسند کرتے ہو تمہارے

بستر پر نہ بلائیں اور اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں ایسی ہلکی مار مارو جس سے ان کے بدن پر نشان ظاہر نہ ہوں۔ (اور اگر وہ دوبارہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں) تو دستور کے مطابق ان کا نان ونفقہ تمہارے اوپر فرض ہے۔

دور جاہلیت میں خواتین کی حالت بد سے بدتر تھی۔ وراثت میں ان کا کوئی حق نہ تھا۔ نہ طلاق کی کوئی مدت وعدت تھی نہ نکاح کی کوئی حد، دو حقیقی بہنوں کے ساتھ نکاح کو جائز سمجھا جاتا تھا۔ باپ کے انتقال پر حقیقی ماں کو چھوڑ کر باپ کی دوسری بیویاں ورثاء کے تصرف میں آجاتیں۔ کوئی خاتون جب بیوہ ہوتی تو اسے اذیت ناک صورتحال سے گزرنا پڑتا۔ گھر سے باہر اسے نہایت تنگ کوٹھری میں رہنے پر مجبور کیا جاتا۔ بچیوں کی پیدائش باعث عار سمجھی جاتی۔ اسی وجہ سے وہ اسے زندہ دفن کر دیتے۔ غرض عورت اس معاشرے میں بدترین مخلوق تھی۔ یہی حال خواتین کا دنیا کی دوسری قوموں میں بھی تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں عورت ایک بے روح مخلوق تصور کی جاتی تھی۔ جس کا نہ کوئی حق تھا اور نہ کوئی عزت تھی۔ ہندوؤں کے یہاں دیوداسی کا نظام تھا جس میں ان کی عصمت وعزت تارتار کی جاتی، اپنے شوہر کی چتا پر اسے بھی جلنا پڑتا تھا۔ الغرض عورتوں کو کسی جگہ بھی عزت وتکریم کا مقام حاصل نہ تھا۔ وہ شر کا مجسم اور تمام برائیوں کا سرچشمہ تصور کی جاتی تھی۔

ایک طرف اس صورت حال کو ذہن میں رکھیں اور دوسری طرف دور جدید کی عورت کا سرسری جائزہ لیں۔ مغرب کو بڑا ناز ہے کہ اس نے عورتوں کو حقوق دیے۔ حقوق نسواں کے لیے بڑی بڑی تحریکات کام کر رہی ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود ایک عورت کو جو حقیقی عزت وتکریم اور تحفظ ملنا چاہیے تھا اس سے وہ آج بھی محروم ہے۔ آج بھی بچیوں کو نشو ونما پانے سے پہلے ہی قتل کر دیا جارہا ہے۔ آج بھی عورتوں کی عزت وناموس محفوظ نہیں، جہیز زنا اور اغوا کے اعداد وشمار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں بھی خاتون جبر واستبداد اور ظلم وتعدی کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکی ہے اور نہ ہی اس کو عزت وشرافت کی زندگی نصیب ہوئی ہے۔

آپ ؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبے میں سماج کے اس مظلوم گروہ کے حقوق بیان کیے۔ آپ ؐ نے نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ لوگو عورتوں کے معاملے میں اللہ کی پکڑ سے ڈرو۔ اس کمزور ولطیف مخلوق کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرو۔ یہ نازک آبگینے ہیں ان کے ساتھ رأفت والفت سے پیش آؤ۔ ان کے باب میں میری نرمی اور خیر خواہی کی وصیت ہے اسے قبول کرو۔ اس خطبہ میں جہاں آپ ؐ نے

عورتوں کے حقوق بیان فرمائے وہیں ان کی ذمہ داری بھی بیان کی کہ وہ مردوں کی امانت کا پاس ولحاظ رکھیں اور فسق وفجور کی روش اختیار نہ کریں۔ خطبہ نکاح میں جو آیات قرآنیہ پڑھی جاتی ہیں ان میں بھی بار باراللہ سے ڈرنے اور رشتے ناطے کا لحاظ کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے خواتین کے تعلق سے اللہ سے ڈرنے کی تاکید فرمائی۔ اور اس کے حقوق اور عزت ناموس کو تحفظ دے کر اس کے وقار کو بلند کیا۔

غلاموں کے حقوق:

اس کے بعد آپؐ نے غلاموں کے حقوق کا تذکرہ کیا۔ غلاموں کے متعلق بھی آپؐ نے حسن سلوک کی تلقین کی اور فرمایا: لوگو! غلاموں سے اچھا برتاؤ کرنا جیسا تم کھاتے ہو ویسا ان کو کھلانا اور جیسا تم پہنتے ہو ویسا ان کو پہنانا۔ (محمد رسول اللہ۔ ڈاکٹر حمید اللہ)

سود کی حرمت:

معاشی استحصال کی جڑ کاٹتے ہوئے آپؐ نے سودی لین دین کی حرمت کا اعلان فرمایا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ألا وان كـل ربـا من ربا الجاهلية موضوع، لكم رؤوس اموالكم لا تظلمون ولا تظلمون. ألا أمتاه هل بلغت؟ ثلاث مرات ۔(ابن ماجہ:۳۰۵۵)

سن لو جاہلیت کے تمام سود معاف کر دیے گئے تم صرف اپنا اصل مال لے لو نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم ہو۔ آگاہ رہو اے میری امت کے لوگو! کیا میں نے اللہ کا حکم پہنچا دیا؟ آپ نے ایسا تین مرتبہ فرمایا۔ آپؐ نے سب سے پہلے اپنے خاندان میں سے عباس بن عبدالمطلب کے سود کو معاف کرنے کا اعلان کیا۔(مسلم:۲۹۵۰)

سود کی حرمت کا اعلان فرما کر آپؐ نے معاشی عدم توازن کا سدباب کیا۔ کیونکہ سود کے راستے سے بھی سرمایہ دار طبقہ کو محفوظ طریقے سے دولت جمع کرنے کا راستہ فراہم ہوتا ہے۔ اس لیے آپؐ نے اس راہ کا سدباب کیا۔ تاکہ سماج میں معاشی توازن قائم ہو سکے۔

خطبہ حجۃ الوداع کی اہمیت:

خطبہ حجۃ الوداع غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اسے سنانے کے لیے آپؐ نے غیر معمولی اہتمام فرمایا۔ اپنی باتوں پر لوگوں کو بھی گواہ بنایا اور اللہ وحدہ لاشریک

کوبھی کہ آپؐ پر تبلیغ دین کی جو عظیم ذمہ داری ڈالی گئی تھی اسے آپؐ نے امت تک پہنچا دیا۔ آپؐ نے لوگوں سے بار بار پوچھا لوگو! تم سے میرے متعلق سوال ہوگا، تو تم کیا جواب دو گے؟ انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا ایک ہی جواب تھا: بلغ رسول اللہؐ۔ اللہ کے رسولؐ پر پہنچانے کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اسے آپ نے پوری امانت داری کے ساتھ انجام دے دیا۔ اخیر میں آپؐ نے اس عظیم ذمہ داری کو امت محمدیہؐ کے سپرد کر دیا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ امت آپؐ کے اس عظیم پیغام کو لے اٹھے اور سارے عالم کو مساوات بنی آدم اور حقوق انسانی کے صحیح تصور سے روشناس کرائے۔

مساوات بنی آدم اور حقوق انسانی کے اس عالمی منشور میں جو ہدایات دی گئیں ہیں وہ عالمی امن و سلامتی اور عظمت انسانی کی ضمانت دیتی ہیں۔ کیونکہ اس میں معاشرتی مساوات، نسلی و قبائلی تفاخر کا خاتمہ، خواتین کے حقوق اور ان کے ساتھ نرمی، محبت اور حسن سلوک کی تعلیم، غلاموں اور زیر نگیں طبقہ کے ساتھ حسن سلوک، ایک دوسرے کے جان و مال اور عزت و آبرو کا احترام، معاشی توازن کا قیام وغیرہ امور پر بہت دلسوزی کے ساتھ امت کو عمل پیرا ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔ ان اصولوں پر تشکیل پانے والا معاشرہ امن و شانتی اور رحمت کا گہوارہ ہوگا۔ جہاں حقوق انسانی محفوظ ہوں گے اور ان کی پامالی کی کوئی جرأت نہ کر سکے گا۔

یوں تو ہر سال یوم حقوق انسانی کی پر شکوہ تقریبات سارے عالم میں ہوتی ہیں۔ اور اس دن حقوق انسانی کی عظمت اور بحالی کی خوب باتیں بھی کی جاتی ہیں۔ مگر دوسری طرف عملاً حقوق انسانی کی پامالی جس طرح ہوتی ہے اس سے اس دن کو منانے کا کوئی معنی نہیں رہ جاتا۔ گزشتہ دو دہائی کا ہی عالمی منظر نامہ دیکھ لیں۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کا خون بہا ہے۔ افغانستان، عراق اور شام کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ دس لاکھ سے زیادہ جانیں چلی گئیں۔ اسرائیل مظلوم فلسطینیوں پر مسلسل کئی دہائیوں سے بے نظیر ظلم و بربریت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ برما کی صورتحال یہ ہے کہ ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور لاکھوں لوگوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ آج وہ دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ کیمپوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ ہندوستان کے حالات روزانہ حقوق انسانی کی پامالی کی نئی داستان رقم کرتے ہیں۔ راہ چلتے کسی کو بھی اس کی مخصوص شناخت کی وجہ سے ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے سب اس تشدد کا شکار ہیں۔

حقوق انسانی کی باتیں کرنے والے اور یوم حقوق انسانی منانے والے کہاں ہیں؟ ان کی زبانیں

کیوں گنگ ہوئیں؟War against terrorismاور batting terrorism کا خوشنما نام دے کر نہایت عیاری کے ساتھ معصوم انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے۔کیا ایسے لوگوں کو یوم حقوق انسانی منانے کا حق ہے؟ کیا ایسے لوگوں کو مساوات انسانی کی باتیں کرنا زیب دیتا ہے؟ ہرگز نہیں۔یہ انسانیت کے محافظ نہیں بلکہ دشمن ہیں۔حقوق انسانی کو پامال کرنے والے ہیں۔ان کی باتیں باوزن،ان کے دعوے کھوکھلے،ان کی چالیں مکروفریب اوران کے چہرے دورنگے ہیں۔

وہی ہے جنگ کی تیاریوں میں بھی مصروف
اڑارہاہے وہی امن کے کبوتر بھی

اللہ سے دعا ہے کہ وہ امت مسلمہ کو نبی آخرالزماںؐ کی آخری وصیت پر عمل پیراہوتے ہوئے امن عالم،مساوات انسانی اورحقوق انسانی کے تحفظ کے لیے قربانیاں دینے کی توفیق دے۔آمین

مطالعہ

......ضرورت، اہمیت اور جہات......

شمشاد حسین فلاحی، مدیر ماہنامہ حجاب اسلامی، نئی دہلی

موبائیل نمبر: 09990056137

مطالعہ کی ضرورت واہمیت کے بارے میں اگر کچھ کہا جائے تو اتنا کافی ہے کہ یہ زندگی سے بھر پور اذہان وقلوب کی غذا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح انسانی جسم کی بقا اور اس کی صحت کے لیے مادی غذا کی ضروت ہوتی ہے۔ انسان اور حیوان کے درمیان فرق کرنے والی اور حد فاصل کھینچنے والی شے عقل وفکر ہے۔ حیوانات اپنی زندگی کو چارے اور اس غذا کی بنیاد پر باقی رکھتے ہیں جو قدرت نے ان کے لیے مہیا کی ہے۔ اس معاملے میں انسان اور حیوان دونوں برابر ہیں۔ لیکن کیونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفکر کی دولت دے کر اسے حیوانات سے ممتاز کیا ہے اس لیے اس کی اضافی غذا وہ چیزیں بھی قرار پاتی ہیں جو اس ممتاز اور نمایاں عنصر کو بقا فراہم کرنے والی ہوں۔ اور مطالعہ اپنی تمام انواع کے ساتھ انسان کی اسی بنیادی ضرورت کی تکمیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے قوت عقل وخرد دے کر اس کے لیے لازم قرار دی ہے۔

جو لوگ اپنی اس ضرورت کے ادراک سے غافل یا بے بہرہ ہوتے ہیں ان میں اور چوپایوں میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ انسان کا علم اور اس کا فکری ارتقاء اسی مطالعہ پر موقوف ہے۔ انسان اپنی اس ضرورت کے سلسلے میں جس قدر حساس اور اس کی تکمیل کے لیے جس قدر متحرک ہوگا وہ اسی قدر ممتاز اور بلند ہوگا۔ مطالعہ خواہ کسی بھی طرز کا ہو انسان کی اس اہم ضرورت کی تکمیل کرتا ہے جو اس کی تخلیق کا بنیادی عنصر ہے اور وہ علم ہے۔ اس بنیادی خوبی اور امتیازی صفت کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ کی نمایاں صفت قرار دیا اور انھیں دیگر تمام مخلوقات پر فوقیت دی۔ قرآن مجید نے اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے:

وعلّم آدم الأسماء كلّها ثم عرضهم على الملائكة فقال انبئونی بأسماء هؤلاء ان کنتم صادقین، قالوا سبحانك لا علم لنا الا ما علّمتنا انّك أنت العلیم الحکیم۔

(اور اللہ نے آدمؑ کو سب چیزوں کے نام سکھادئے پھران سب چیزوں کو فرشتوں کے سامنے کیا پھر کہا کہ اگر تم سچے ہوتو ان سب چیزوں کے نام بتاؤ۔انھوں نے کہا کہ پاک ہے تو،ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے دیا ہے۔بیشک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔)

علم انسان کا خاصہ ہی نہیں اس کی بنیادی ضرورت بھی ہے۔اس کی تکمیل کا واحد ذریعہ یہی مطالعہ ہے خواہ وہ کسی صورت میں ہو۔خیروشر،اچھے اور برے نیز مفید اور مضر کا علم انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے علم لابدی چیز ہے۔اوراگر کامیابی کے حقیقی تصور سے جہل کی تاریکیوں کا پردہ چاک کرکے دنیا کے بعد کے منظر نامے کو بھی لیں تو آخرت کی کامیابی کا تمام تر دارومدار اسی علم پر نظر آئے گا جو انسان کو مطالعہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔علم اور مطالعہ کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ انسان شر سے خیر کو ممتاز کرسکے،جہل کے بجائے روشنی حاصل کرسکے،تباہی و بربادی کے بجائے صلاح وفلاح کا فارمولہ جان لے اور اپنی زندگی کو حسین بنا سکے۔صاحب عقل وخرد مخلوق ہونے کے ناطے انسان کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات سے لے کر اپنے معاشرہ تک کی فلاح کے راستوں کو جانتا ہو اور اچھی معاشرت اور شائستہ تہذیب کو لے کر چلنے کے لائق ہو،نیز مسائل حیات،خواہ وہ کسی بھی شعبہ سے متعلق ہوں،ان کا حل علم وفکر اور عقل وتدبر کی بنیاد پر کرسکے۔چنانچہ یہ بات کہ مطالعہ اور علم کا حصول ضروری ہے اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک یہ بھی نہ کہا جائے کہ مطالعہ کا مقصد صالح اور بلند تر ہو۔مطالعہ اور محض وہ مطالعہ جو انسان کی حیوانی ضروریات کی تکمیل کرتا ہو،اس کو محض پیٹ بھرنے کے طریقہ سکھاتا ہو،اسے دولت کمانے کی فعال اور کامیاب مشین بناتا ہو کسی بھی صورت درست اور صحت بخش نہیں کہا جاسکتا۔یہ اسی وقت صحیح اور مفید ہوسکتا ہے جب وہ انسان کو انسانیت کی عظمت سے بھی واقف کرانے والا،عرفان ذات کا ذریعہ اور جہل کی تاریکیوں کا پردہ چاک کرنے والا ہو کہ حقائق حیات اور حقائق کائنات کے ان گوشوں کو بھی انسان پر روشن کردے جسے عام لوگ غیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ایک مومن انسان سے کتاب کا،اپنی ذات کا اور کائنات کا ایسا دقیق مطالعہ مطلوب ہے جو غیب کے پردوں کو چاک کرکے اسے عین یقین فراہم کردے۔

قرآن مجید اس غرض سے انسان کو تفکر،تدبر اور مشاہدہ کی زبردست قوتوں سے آراستہ کرنا چاہتا

ہے۔ جہاں تک کتابوں کے مطالعہ اور معلومات تک رسائی کا سوال ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کے دور میں جس قدر کتابیں شائع ہو رہی ہیں، جس قدر پڑھنے پڑھانے کا رواج ہے اور معلومات کا جو خزانہ ہر فرد کے لیے مہیا ہے وہ تاریخ کے کسی بھی دور میں نہ رہا ہوگا۔ مگر اس کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ جہالت کا گھور اندھیرا جس قدر آج ہے، شاید کبھی پہلے نہ رہا ہو۔ اس لیے ضرورت ہے کہ مطالعہ کا مقصد اور اس کی صحیح وصحت مند سمت کا بھی خیال رہے۔ اس دورِ علم کی اصل خرابی یہی ہے کہ یہاں مطالعہ کو محض حصول علم اور حصول معلومات کا ذریعہ بنایا گیا ہے جبکہ انسان کی فطری ضرورت یہ ہے کہ اسے ذہنی وفکری صحت اور اخلاقی وروحانی ارتقاء کا ذریعہ بھی بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم وفنون کے میدان کی تمام تر تحقیقات اور سائنس وٹکنالوجی کی تمام تر ترقیات کے باوجود انسانوں کے ذہن ودماغ اور ان کے دلوں میں اندھیرا ہے نتیجتاً یا تو وہ حیوان صفت ہو گئے ہیں یا محض ایک مشین۔

علم کے حصول اور مطالعہ کی یہ ضرورت واہمیت تو عام انسان کے لیے ہے لیکن وہ لوگ جو کسی زندہ، متحرک اور انقلابی فکر کے حامل ہوں ان کے لیے تو مطالعہ رگِ حیات کی مانند ہے۔ وہ افراد جو کسی فکری تحریک سے وابستہ ہوں، دنیا کو ایک خاص طرز پر لانے اور ایک حسین رنگ میں رنگ دینے کا عزم وارادہ اور مقصد رکھتے ہوں ان کے لیے مطالعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل اور انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔ مختلف النوع کتب کا مطالعہ، نظریات ورجحانات کا مطالعہ، گردوپیش کا مطالعہ اور آفاق وانفس کا مطالعہ ان کی ضرورت ہوتا ہے۔ کارگاہ حیات میں یہ مطالعہ ان کے لیے مہمیز بھی ہوتا ہے اور دنیا کی تاریکیوں میں روشنی بھی، حقائق کے ادراک کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور انکشافات کا سبب بھی۔ اگر یہ مطالعہ تحریک اور تحریک کے افراد میں عام نہ ہو تو پھر تحریکیں رکے ہوئے پانی کے مانند جوہڑ بن جاتی ہیں اور ان کے نعرے کھوکھلے دعوے اور بے بنیاد بیانات۔ اس لیے افراد تحریک اور تحریکات کے لیے زندگی کا ذریعہ بھی یہی مطالعہ قرار پاتا ہے۔

کتابوں کا مطالعہ انسان کی شخصیت کو ارتقاء کی بلند منزلوں تک پہنچانے کا اہم ذریعہ، حصول علم ومعلومات کا وسیلہ اور علمی تجرباتی سرمایہ کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے اور ذہن وفکر کو روشنی فراہم کرنے کا معروف ذریعہ ہے۔ کتاب یا کتابیں انقلاب بھی ہوتی ہیں اور انقلاب کا ذریعہ بھی، یہ افراد کو راز حیات سے آشنا کرا سکتی ہیں اور افراد کو سوز حیات بخش سکتی ہیں۔ ہم نے بارہا پڑھا اور سنا ہے کہ کتابوں نے لوگوں کی زندگیوں کو بھی تبدیل کر دیا اور اقوام کے طرز فکر وعمل کو بھی بدل ڈالا۔ کارل مارکس

نے انہی کتابوں کو ایک نظریہ کی تبلیغ اور انقلاب کے کامیاب وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔ ڈارون نے کتاب ہی کے ذریعہ لوگوں کے افکار کو جھنجھوڑ ڈالا، قاسم امین نے مصر میں تحریر المرأۃ لکھ کر سماجی بیداری پیدا کی اور ارسطو، افلاطون کے علاوہ بے شمار فلسفیوں اور مفکرین کے نتائج فکر و تحقیق ہمیں صرف اور صرف انہی کتب کے ذریعہ پہنچے۔

موجودہ دور میں کتب کی اشاعت اور اس میدان کی وسعت نے پوری دنیا کی معلومات اور افراد کے تجربات میں شرکت کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ علم کے پھیلاؤ کے سبب کتابوں کی اشاعت اور مانگ دونوں میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔

مطالعہ کتاب کئی پہلوؤں سے تفکر، تدبر اور مشاہدہ پر فوقیت رکھتا ہے۔ کتاب کی تاثیر اور اس کے اثرات معاشرہ اور سماج ہی پر نہیں افراد پر بھی دیرپا ہوتے ہیں۔ کتب کا مطالعہ انسان کے لیے جہاں معلومات کا ذریعہ ہوتا ہے وہیں اس کے ذوق لطیف، اس کے وجدان اور اس کی طبیعت کو تازگی بخشنے کا بھی ذریعہ ہے۔ تفریحی مطالعہ ہماری قوت کار کو بھی بڑھاتا ہے اور معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔

کتاب کی ایک خوبی اور بھی ہے کہ یہ انسان کی ایسے وقت میں رفاقت کرتی ہے جب کوئی آپ کا رفیق نہ ہو اور آپ تنہا ہوں، معروف کہاوت ہے کہ ''آدمی کا بہترین دوست اور ہم نشین کتاب ہے۔''

اسی ہم نشین کے سہارے کتنے ہی عظیم افراد نے جیل کی سلاخوں کے پیچھے عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ صرف کر دیا۔ جیل جہاں زندگی تنگ ہو جاتی ہے وہاں انھوں نے محض اس کتاب کے سہارے لوگوں کو اتنے کارآمد اور مفید تجربات دیئے جو بہ صورت دیگر ناممکن تھے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کو مطالعہ کتاب سے الگ کر لے تو گویا اس نے خود کو منبع حیات سے دور کر لیا۔

مطالعہ کی ضرورت و اہمیت پر ان ابتدائی باتوں کے بعد یہ سمجھ لینا بھی ضروری اور مفید ہے کہ مطالعہ کو محض کتابوں تک محدود کر دینا درست نہیں۔ کتب کا مطالعہ تو معلوم حقائق کا علم دیتا ہے جبکہ اس ہر لمحہ پھیلتی اور ترقی پذیر کائنات میں بے شمار حقائق ہنوز نامعلوم ہیں۔ اور ان نامعلوم حقائق کا علم صرف اور صرف تفکر و تدبر اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ نیوٹن نے قوت کشش کا نظریہ (Theory of gravitaional force) کسی کتاب کے مطالعہ سے حاصل نہیں کیا۔ بلکہ اس عظیم حقیقت کا انکشاف اس پر کائنات کے دقیق مطالعہ، مشاہدہ اور تفکر و تدبر کے نتیجہ میں ممکن ہو سکا۔ اس لیے کتاب کا مطالعہ اور یہاں موجود حقائق کا باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ بھی حقائق کے انکشاف اور علم کے حصول کا

اہم ذریعہ ہے۔ کتاب کائنات کے مطالعہ اوراس کے مشاہدہ سے عقل انسانی ارتقاء کی منزلوں تک سفر کرتی اور تکمیل کی جانب گامزن ہوتی ہے۔ اس سے اسے قوت وغذا حاصل ہوتی ہے اور علوم کے خزانوں تک رسائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنے پڑھنے والوں کو جابجا اس طرف متوجہ کرتا ہے اور **أفلا تدبرون، أ فلا يبصرون** اور **أ فلا يتفكرون** کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے عقل انسانی کو کچوکے لگاتا ہے کہ وہ ان حقائق کے ادراک کے لیے آگے بڑھے جواب تک اس کے لیے پردۂ غیب میں ہیں۔ وہ جگہ جگہ حقائق پر انسان کی قوت فکر، عقل، تدبر اور مشاہدہ کو گواہ بناتا ہے، مثال کے لیے ملاحظہ ہوں چند آیات:

أ فلم يسيروا فى الأرض فينظروا كيف كان عاقبة المكذبين۔

(کیا یہ زمین پر نہیں چلتے کہ اس بات کا مشاہدہ کریں کہ انکار کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔)

أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب أقفالها۔

(کیا یہ قرآن پر غور وفکر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں۔)

قل نار جهنم أشد حرا لو كانوا يفقهون۔

(کہہ دو کہ جہنم کی آگ زیادہ شدید گرم ہے اگر یہ سمجھیں۔)

وللدار الآخرة خير للذين يتقون أفلا تعقلون۔

(اور آخرت کا گھر اللہ کا تقویٰ کرنے والوں کے لیے زیادہ بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں؟)

یہ اوراس طرح کی درجنوں آیات ہیں جہاں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر مقام پر اپنی عقل، اپنی فکر اور اپنی قوت باصرہ ومشاہدہ کو اپنا ہم سفر بنائے رکھیں۔ وہ دوران سفر بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرتے رہیں اور حضر میں بھی اس کی قوت تخلیق کو دیکھ کر اس تک پہنچنے کی سعی کریں۔ وہ انسان کو دعوت دیتا ہے کہ اپنے آس پاس کے ماحول اور خود اپنے اندر جھانک کر دیکھیں۔ اور مشاہدہ کریں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ کتاب ناخواندہ کے مانند ان کے سامنے ہے۔ اور ان تمام کے بغور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اسی مطالعہ اور مشاہدہ کو انسان کی کامیابی سے وابستہ کرتا ہے۔ اس لیے ایک ہوش منداور دانا و بینا قاری کو اپنے ذہن وفکر کا افق وسیع کرنا چاہیے اور ان مطبوعہ کتب کے خزانہ کے ساتھ ساتھ اس عظیم خزانہ کا بھی بنظر غائر مطالعہ کرنا چاہیے جو ہنوز انسانوں کے لیے ناقابل مطالعہ ہے۔

کتاب کائنات اور اللہ تعالیٰ کی ہر سو پھیلی نشانیوں کے مطالعہ کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ کائنات سے متعلق نئے نئے انکشافات ہوں اور اس کا علم حاصل ہو سکے۔

جب نیوٹن جیسے ناخدا شناس انسان اور اس جیسے بے شمار افراد نے محض اس کتاب کائنات کے مطالعہ سے دنیا کو علم و تحقیق کے بیش بہا خزانوں سے ہمکنار کیا تو اندازہ کیجئے کہ پھر بندۂ مومن اپنے خالق کی تخلیق کردہ کائنات کا اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق مطالعہ کرے گا تو دنیا کے لیے کس قدر انکشافات ہوں گے اور کتنا بیش بہا علم حاصل ہوگا۔ اگر ایک خدا بیزار فرد ایسا کرسکتا ہے تو ہم مومنین تو اس کے اور زیادہ حقدار ہیں کہ اس بحر بیکراں سے علوم و انکشافات کے گوہر حاصل کریں اور دنیا کو لٹائیں۔

ہماری اس بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم مطالعہ کتب کی اہمیت سے صرف نظر کرنا چاہتے ہیں یا شائقین مطالعہ کو مطالعہ کتب سے ہٹا کر محض مطالعہ کتاب کائنات میں گم کر دینا چاہتے ہیں بلکہ ہم مطالعہ کی جہتوں کو کامل و شامل بنا کر اتنا وسیع کر دینا چاہتے ہیں کہ انسان ہر جگہ اور ہر ہر قدم پر محو مطالعہ رہے اور حقائق کائنات کا ادراک کر کے علم و معرفت کے خزانے سمیٹتا رہے۔ مطالعہ کتب بلاشبہ حصول علم و معلومات کا انتہائی اہم ذریعہ ہے مگر اس سے آگے بھی ایک جہاں ہے جو قارئین سے توجہ چاہتا ہے۔

حصول علم کی ایک اور جہت اور مطالعہ کا ایک اور اہم ذریعہ قلب انسانی بھی ہے۔ جب وہ علم وحی سے منور ہو جاتا ہے تو ہر چہار جانب سے اسے علوم کے دریا بہتے نظر آتے ہیں۔ علامہ عبدالرؤوف المناوی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا:

لا تقولوا:

العلم فی السماء من ینزله؟

ولافی تخوم الارض من یصعد به؟

ولا من وراء البحار من یعبر یاتی به؟

العلم محصور فی قلوبکم ، تأدّبوا بین یدیّ بآداب الروحانیین وتخلقوا بأخلاق الصدیقین أظهر العلم من قلوبکم حتی یغطیکم ویعمرکم ویعمّرکم۔

(یہ نہ کہو کہ:

علم تو آسمان میں ہے وہاں سے کون اتار کر لائے؟

یا روئے زمین کے دور دراز علاقوں میں ہے وہاں سے کون اسے حاصل کرے؟

یا سمندروں کے پار ہے وہاں سے کون لائے؟

(نہیں!) علم تو تمہارے سینوں میں محفوظ ہے (میرے بندو!) میرے سامنے اہل روحانیت کے طور طریقے اختیار کرو اور صدیقین کے آداب و اخلاق اپناؤ تاکہ میں علم کو تمہارے سینوں سے نمودار کر دوں کہ وہ تمہیں ڈھانپ لے اور تمہاری تعمیر نو کر دے۔)

حضرت امام مالک نے یہی بات ان الفاظ میں کہی تھی:

''انما العلم نور یقذفه الله فی القلب''

(بلاشبہ علم تو ایک روشنی ہے جسے اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتا ہے۔)

ان دونوں باتوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ سے علم کا طالب ہوتا ہے تو وہ علوم وعرفان کے دروازے اس طالب علم کے لیے اس طرح کھول دیتا ہے کہ وہ جس طرف بھی نظر ڈالتا ہے اس کو علم وعرفان کے چشمے ابلتے نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ بلاشبہ نکالا جا سکتا ہے کہ دوران مطالعہ اپنے ذہن وفکر کو اللہ تعالیٰ کی طرف مرکوز اور متوجہ رکھنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو معلومات کا حصول تو ممکن ہے لیکن علم حقیقی اور عرفان کے دروازوں کا وا ہونا ضروری نہیں۔

مطالعہ کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے اندر علم کی پیاس بھڑک اٹھے۔ ایسی پیاس جس کی سیری کی کوئی شکل ممکن نہ ہو یہاں تک کہ ہم دنیائے فانی سے کوچ کر جائیں۔ اس لیے کہ مطالعہ کا حقیقی شوق انسان کو اپنی کم علمی اور جہل کا ادراک کراتا ہے۔ اس طرح اسے جہل کو علم میں بدلنے کی تڑپ پر بھی منتج ہونا چاہیے کیونکہ علم کی خصوصیت یہ ہے کہ ''علم تمہیں اپنا کچھ حصہ بھی اس وقت تک نہیں دے گا جب تک تم اپنے آپ کو کلیتاً اس میں فنا نہ کر دو۔'' یہی وجہ ہے کہ ایک طالب علم اور مطالعہ کا مشتاق کسی مقام پر ٹھہرتا نہیں اور نہ ہی اس احساس کا شکار ہوتا ہے کہ اس کے پاس کافی علم ہو گیا ہے۔ یہ ایسا سفر ہے کہ جس میں بڑھنے والا ہر قدم مزید آگے بڑھنے اور مسلسل آگے بڑھتے رہنے کے لیے مہمیز دیتا ہے۔ اسی حقیقت کے ادراک کے بعد ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے کہا تھا کہ ''لا أدری (یعنی میں نہیں جانتا) نصف العلم ہے۔''

انسان کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ آخر علم ومطالعہ کا بلند ترین مقام کیا ہے؟ اور اسے بتدریج اپنی ذات اور شخصیت کو کس مقام تک لے جانا ہے؟ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ اس کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہو جائے۔ جو شخص دنیا بھر کی معلومات رکھتا ہے، افراد کی خوبیوں اور خرابیوں کا علم رکھتا ہے مگر اپنے کردار اور اپنی شخصیت کے برے اور

بھلے پہلوؤں سے ناواقف ہے تو وہ دراصل جہل مطلق کا شکار ہے اور اس کا مطالعہ اور معلومات کے وہ تمام کے خزانے جو اس نے اپنے ذہن و دماغ میں جمع کر رکھے ہیں اس کے لیے بے کار اور بے سود ہیں۔مولانا رومیؒ نے فارسی زبان میں کہا تھا (جس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے):

(تو یہ جانتا ہے کہ فلاں چیز جائز ہے اور فلاں ناجائز، مگر اس بات پر بھی اچھی طرح غور وفکر کر کہ تو خود جائز ہے یا ناجائز؟)

(ہر سودے کی قیمت کا تجھے علم ہے لیکن اگر تو اپنی قیمت نہیں جانتا تو احمق ہے۔)

(تمام علم وفضل کی روح صرف اور صرف یہ ہے کہ تم جان جاؤ کہ کل قیامت کے دن کیا ہوگا۔)

اگر ہمارا علم و مطالعہ ان حقائق کے ادراک میں ہماری مدد نہیں کرتا تو ہمیں غور وفکر کرنا چاہیے۔کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم کتب کی ورق گردانی میں اس قدر گم ہو گئے ہیں کہ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کے بجائے اسے بھلا بیٹھے اور اپنی ذات کا علم حاصل کرنے کے بجائے دنیا میں موجود معلومات کے حصول میں گم ہو کر رہ گئے۔اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ہمارا تمام تر مطالعہ اور پورا علم ہمارے لیے معلومات کا ذریعہ تو ہوسکتا ہے مگر اس کامیابی کا ذریعہ نہیں بن سکتا جو ایک بندۂ مؤمن اور ہوش مند انسان کا مطلوب ومقصود ہے۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضؓ

…… پیکرِ صبر واستقامت ……

ڈاکٹر محمد افضل فلاحی، رکن شوری جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

موبائیل نمبر:09651377057

اس وسیع کائنات کے ایک چھوٹے سے حصے غارحرا سے جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو اس وقت پورا عرب بت پرستی کے تاریک اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں غرق تھا۔ اسلامی افکار وعقائد کی شعاعیں جیسے جیسے اپنے دامن فیض کو وسیع کرتی گئیں، کفر والحاد کی تاریکیاں کافور ہوتی چلی گئیں اور آخر کار تہذیب اسلامی کی صبح صادق نمودار ہوئی۔ یہیں سے سرور کائناتﷺ کی قیادت میں خدا کی سرزمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی عظیم جدوجہد کا آغاز ہوگیا۔ مشرکین مکہ جو اَب تک اپنی قوت واقتدار اور مال وزر کے نشہ میں چور، شرک کی نجاست غلیظہ میں آلودہ اور کبر کے مرض میں مبتلا تھے، اسلامی تعلیمات کو پھیلتے دیکھ کر غصہ، حسد اور انتقام کی آگ میں جلنے لگے۔ ان کا امن وسکون چھن گیا، نیندیں حرام ہوگئیں، لہٰذا سر جوڑ کر بیٹھے اور اسلام کے خاتمے کی تدبیریں کرنے لگے۔ اس ناپاک اور گھناؤنی سازش میں ابوسفیان ابن حرب ابن امیہ کا گھرانہ پیش پیش تھا۔ یہ مکہ کے ممتاز گھرانوں میں سے ایک تھا لیکن افسوس کہ اس آنگن میں ظلمت کفر وشرک سایہ فگن تھی۔ پورا خاندان ضلالت وگمراہی کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا اور اسلام کا جانی دشمن بنا ہوا تھا۔ توحید کے خاتمے کے لیے یہ ہر طرح کی سازشوں میں ملوث رہتا تھا۔

دین اسلام سے اس خاندان کو کیسی عداوت تھی اس کا اندازہ صرف غزوۂ احد کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب محمدﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب شہید ہوگئے تو ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے ان کا سینہ چاک کر کے جگر اور دوسرے اعضاء نکالے اور ان کو چبا گئی، نگل نہ سکی تو تھوک دیا۔ ایسے خاندان کی بیٹی تھیں حضرت ام حبیبہؓ۔ ایک سترہ سالہ حوصلہ مند، غیور اور شیر دل بیٹی کا ایسے گھرانے سے

دین اسلام میں داخل ہونا یقیناً دہکتے انگاروں پر لیٹنے کے مترادف تھا۔ باوجود اس کے وقت کے تمام چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے حضرت ام حبیبہؓ توحید کا پرچم اٹھائے قافلہ حق کے ساتھ چل پڑیں۔ آپؓ پاکیزہ روح، نیک فطرت اور سادہ مزاج تھیں۔ دل آئینہ کی طرح صاف شفاف تھا۔ لہٰذا توحید کی روشنی جب آپؓ کے آئینہ قلب پر پڑی تو دل نورِ ایمان سے منور ہوگیا۔ ابوسفیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ بت کدہ کے حصار کو توڑ کر اس کی نورِ نظر اور بڑی صاحبزادی رملہ نے اس کے اپنے ہی آنگن میں اسلام کی شمع روشن کرنے کی جرأت کی ہے تو وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے اور چلا اٹھے کہ آہ میری باغی و سرکش بیٹی۔ آج سے تو میرے لیے مر چکی ہے۔ ماں ہندہ چیخ اٹھی کہ میں اپنی اولاد پر دین محمد کی پرچھائیاں تک نہ پڑنے دوں گی۔ ہر چند کہ ابوسفیان اور خاندان کے تمام لوگوں نے نہ صرف یہ کہ مخالفت کی بلکہ طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں، ظلم و ستم کی انتہا کر دی، پھر بھی حضرت ام حبیبہؓ کی ثابت قدمی اور استقلال میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔

آپ کا مختصر تعارف اس طرح ہے کہ، آپ کا نام رملہ تھا۔ کنیت ام حبیبہ تھی۔ بعثت نبوی سے سترہ سال قبل مکہ میں ولادت ہوئی۔ والد کا نام صخر ابن حرب ابن امیہ تھا۔ کنیت ابوسفیان تھی اور اسی سے شہرت پائی۔ والدہ کا نام صفیہ بنت ابی العاص بن امیہ تھا۔ سوتیلی ماں ہندہ بنت عتبہ تھی۔ نانا عتبہ بن ربیعہ تھے، آپ یزید بن صخر کی حقیقی بہن تھیں، حضرت امیر معاویہؓ کی سوتیلی بہن اور حضرت عثمان غنیؓ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ غرضیکہ ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے آپ بنوامیہ کے معزز گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔

حضرت ام حبیبہؓ تاریخ اسلام کی ان چند برگزیدہ خواتین میں سے ہیں جنہوں نے اپنے ماں باپ بھائی بہن اور رشتہ داروں کی شدید مخالفت کے باوجود اسلام قبول کیا۔ انہیں یہ علم تھا کہ یہ راستہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ ایک پرخار وادی ہے جہاں سفر طویل ہے اور راستہ پُرخطر ہے۔ اس سفر میں دور دور تک نہ سایہ ہے نہ سائبان۔ ریگستان اور بیابانوں سے گزرنا ہے۔ ان سب کے باوجود خوف زدہ نہ ہوئیں۔ ایمان کی رسی کو مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا اور صبر و استقامت کا توشہ ساتھ لے کر راہ خدا میں نکل پڑیں۔ دنیا نے یہ حیرت انگیز منظر اپنی نظروں سے دیکھا کہ باپ محسن انسانیت کا جانی دشمن اور اس کی لاڈلی بیٹی اسلام کی سفیر، باپ اسلام مخالف تمام تخریبی کارروائیوں میں ملوث اور بیٹی اسلامی تعلیمات کا حسین پیکر، باپ جوش انتقام سے مغلوب اور بیٹی ایثار و قربانی کا مجسمہ، باپ طاغوتی لشکر کا کمانڈر تو بیٹی عزیمت

اور استقامت کا کوہ گراں...... بیٹی پیکر نور بنی ہوئی تھی لیکن باپ تاریکیوں میں سفر کر رہا تھا۔ اسلام کا نور دنیا بھر میں پھیل رہا تھا مگر ابوسفیان کا خانہ دل تاریک اور سیاہ تھا۔ جب بیٹی رملہ نے اپنے خاوند کے ساتھ دین محمدﷺ پر عمل پیرا ہونے کا اعلان کر دیا تو پھر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ظلم و جبر کی ایسی انتہا کر دی گئی کہ جس کی تصویر کشی کرنے سے آج بھی الفاظ قاصر ہیں۔ یہ اللہ اور اس کے رسولﷺ کی سچی محبت ہی تھی کہ ام حبیبہؓ ہر آزمائش میں کندن بن کر نکلیں اور تمام صبر آزما حالات میں ثابت قدم رہیں۔ وہ اپنے اندر بادمخالف کی موجوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور طاقت رکھتی تھیں نیز انہوں نے اپنے خون جگر سے ایمان کی قندیل کو روشن رکھا۔

جب مکہ میں ظلم وستم کے بادل گھر آئے اور توحید کے متوالوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تو اللہ کے رسولﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت ام حبیبہؓ بھی اپنے خاوند عبیداللہ بن جحش کے ساتھ ٦ھ (ہجرت ثانیہ) کے آخر میں صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ ہجرت کر گئیں۔ آپ نے حالت حمل میں یہ مشکل اور تکلیف دہ سفر طے کیا۔ وہاں پہنچ کر ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کا نام حبیبہ رکھا گیا۔ اس نسبت سے آپ ام حبیبہؓ سے معروف ہوئیں۔

حبشہ پہنچ کر آپ کی مشکلات کم نہ ہوئیں۔ آپ کے خاوند عبیداللہ بن جحش مرتد ہو گئے۔ ان کا تعلق خاندان اسد بن خزیمہ سے تھا۔ یہ نہایت شریف گھرانہ تھا۔ وہ بالکل ابتدائی دور میں ہی اسلام کے دامن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لیکن عبیداللہ بن جحش کثرت شراب نوشی سے عیسائیت کی طرف راغب ہو گئے۔ آپؓ نے بہت سمجھایا نیز لعنت و ملامت بھی کی، مگر جب وہ نہ مانے تو بالآخر طلاق لے لی۔ جس ایمان کی خاطر ماں باپ، بھائی بہن اور اپنے وطن عزیز کو خیر آباد کہہ دیا تھا اس کے لیے انہیں شوہر کو چھوڑنے میں ذرا بھی تأمل نہ ہوا۔ چنانچہ یہ بدقسمت انسان سرچشمۂ ہدایت کے قریب آ کر بھی ہدایت سے محروم رہا اور بدبختی و نامرادی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

حضرت ام حبیبہؓ غریب الوطنی کی زندگی میں اب صرف ایک معصوم بچی کے ساتھ تنہا رہ گئیں۔ ایک طرف غربت و مسافرت کی حالت، دوسری طرف اجنبی ملک میں شوہر کا ارتداد میں مبتلا ہو جانا، آپؓ کے لیے یہ بہت ہی مشکل اور نازک وقت تھا۔ حضور اقدسﷺ کو جب ان حالات و مصائب کا علم ہوا تو آپﷺ کی رحم دلی اور ہمدردی اس کی متقاضی ہوئی کہ ام حبیبہؓ جنہوں نے اسلام کی خاطر اتنی مشقتیں اٹھائی ہیں انہیں ایسے موقع پر بے سہارا نہیں چھوڑ دیا جائے، بلکہ ان کی دل جوئی کے لیے اپنے نکاح کا

پیام بھیج دینا چاہیے۔ چنانچہ آپﷺ نے عمرو بن امیہ ضمری کو اپنا خط دے کر حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس بھیجا۔ حضرت ام حبیبہؓ خود فرماتی ہیں کہ ابھی ایام عدت میں ہی تھی کہ ایک روز میں نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص مجھے یا ام المومنین کہہ کر پکار رہا ہے۔ اس خواب سے میں بہت پریشانی اور الجھن میں تھی خدایا ماجرا کیا ہے، کہ اچانک ایک روز رسولﷺ کا پیغام مسرت موصول ہوا۔ نجاشی کی باندی ابرہہ میرے پاس آئی اور کہا کہ بادشاہ سلامت نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ حضورﷺ کے فرمان کے مطابق میں اپنی وکالت سے ان کا نکاح آپ کے ساتھ کردوں۔ یہ سن کر خوشی ومسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اپنے کلائی کے کنگن، پیروں کے پازیب اور چاندی کی انگوٹھیاں سب ابرہہ کو دے دیں۔ یہ ۷ھ کے اوائل کی بات ہے۔ اس وقت آپﷺ کی عمر ۵۹ سال اور حضرت ام حبیبہؓ کی عمر ۳۶ سال تھی۔ حضرت ام حبیبہؓ نے اپنے رشتے کے چچازاد بھائی حضرت خالد ابن سعید ابن العاصؓ کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ تمام مسلمانوں کی موجودگی میں بادشاہ نجاشی نے خود نکاح پڑھایا اور چار سو دینار زر مہر حضرت خالد کو عطا کر دیے جسے انہوں نے بعد میں حضرت ام حبیبہؓ کے حوالے کر دیا۔ نکاح کی تقریب سے فراغت کے بعد نجاشی نے کہا کہ دعوت ولیمہ انبیاء کی سنت رہی ہے۔ لہٰذا آپ سبھی حضرات کھانا کھانے کے بعد ہی یہاں سے رخصت ہوں۔ دستر خوان لگا اور تمام حاضرین نے ولیمہ تناول فرمایا۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کی مدینہ روانگی کے لیے نجاشی نے ہر طرح کی سفری سہولیات کا انتظام کیا اور انہیں حضرت شرحبیل ابن حسنہ کی معیت میں روانہ کیا۔ ام المومنین جب مدینہ پہنچیں تو حضورﷺ خیبر کی مہم پر تھے۔ فتح خیبر کے بعد آپؐ مدینہ تشریف لائے تو حضرت ام حبیبہؓ خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں۔ خیر و عافیت کے بعد آپؐ نے بادشاہ نجاشی کے حالات دریافت کیے تو آپؐ نے تمام حالات اور واقعات سے رسول اللہﷺ کو واقف کرایا۔ آپؐ سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ اگر اس نکاح نبوی کی معنویت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ سردار قریش ابوسفیان کی اسلام مخالف مہمات کمزور پڑ گئیں۔ یہ اس وقت کے حالات کے تناظر میں ایک اہم کامیابی تھی۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ حضورﷺ کی نہایت ہی مطیع و فرمانبردار اور وفا شعار بیوی تھیں۔ آپ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ ہر وقت سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتی تھیں۔ رسول اللہﷺ سے محبت کا ایک حیرت انگیز واقعہ تاریخ میں ملتا ہے۔ ۸ھ کی بات ہے۔ سرداران قریش نے صلح حدیبیہ سے روگردانی کر کے قبیلہ بنوخزاعہ سے جنگ کر لی تھی۔ ان لوگوں سے حضورﷺ کا معاہدہ تھا۔ چنانچہ

مسلمانوں نے اس جنگ کے خلاف احتجاج کیا۔سردارقریش ابوسفیان اپنی اس غلطی کی صفائی دینے اور عہد کی تجدید کے لیے مدینہ آئے۔سب سے پہلے اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ کے پاس گئے۔اجازت لے کر گھر میں داخل ہوئے۔آپؐ کے بستر مبارک پر بیٹھنے جارہے تھے کہ حضرت ام حبیبہؓ نے اپنے والدکو بیٹھنے سے یہ کہتے ہوئے روک دیا کہ آپ مشرک ہیں، ناپاک ہیں،حضورﷺ کے بستر مبارک پرنہیں بیٹھ سکتے۔ابوسفیان نے غصہ سے تلملا کر کہا کہ:''لقد أصابك بعدي شراً''تو میرے بعد بہت سی خرابیوں میں مبتلا ہوگئی ہے۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ جیسی پاکیزہ ہستی کوخدا نے اپنے رسولﷺ کی خدمت کے لیےمنتخب کیا تھا۔ہر آن آپ رسول اللہﷺ کی خدمت میں لگی رہتیں۔آپﷺ گھر تشریف لاتے تومسکراتے ہوئے استقبال کرتیں۔خندہ پیشانی سے ملتیں، بستر بچھاتیں، دسترخوان لگاتیں، وضو کے لیے پانی اور مسواک تیار کرتیں، ہر وقت حکم کی منتظر رہتیں اورتعمیل حکم میں دوڑ پڑتیں۔غرضیکہ آپ کی متاع حیات رسول خدا کی محبت تھی۔آپؓ رسول اللہﷺ سے اتنا قلبی اور گہرا لگاؤ رکھتی تھیں کہ اپنی حقیقی بہن کوحضور اقدسﷺ کے نکاح میں پیش کردیا۔آپؐ نے انہیں سمجھایا کہ یہ ایک غیرشرعی عمل ہوگا۔بیک وقت دوسگی بہنیں کسی شخص کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں۔دوسرے یہ کہ آپؐ مزاجاً کثرت ازدواج کی طرف مائل بھی نہ تھے۔جتنے بھی نکاح آپؐ نے کیے وہ سب دینی اورسیاسی حکمتوں کی بنا پرہی تھے۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ ایک جلیل القدر اور نہایت عظیم صحابیہ تھیں۔بڑے فاضل اور کامل اوصاف کی مالک تھیں۔اپنی پوری عمر زہدوتقوی میں بسر کی۔نہایت پاک باز، باعمل، خدا کی پرستاراور بےمثل خاتون تھیں۔مزاج میں سادگی وقناعت تھی۔سنجیدگی وبردباری تھی۔علم دین کاحصول اوراس کی تعلیم ان کا مقصد زندگی تھا۔جوبھی علم سیکھتیں، اس پرخود بھی عمل کرتیں اور دوسروں کوبھی عمل کی تلقین کیا کرتی تھیں۔اسلام کی انقلابی روح سے وہ اس قدر واقف تھیں کہ موت پر بین، گریہ وزاری کونہایت براسمجھتی تھیں۔اپنے والدمحترم ابوسفیان کے انتقال کے تین دن مکمل ہونے پرخوشبومنگائی اور چہرے پر ملی۔اپنے اس عمل سے یہ ثابت کیا کہ موت پر آہ وزاری کرنا اسلام کی روح کے منافی ہے۔بقول ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ:''مجھے اس کی خبر بھی نہ ہوتی اگر میں نے رسول اللہﷺ کو یہ فرماتے نہ سن لیا ہوتا کہ مومنہ عورت کے لیے تین دن سے زیادہ کسی کا سوگ جائزنہیں،سوائے خاوند کے،جس کے سوگ کی مدت چارمہینہ دس دن ہے۔''دیگرازواج مطہرات کی طرح آپ کے پاس بھی علم کاخزانہ تھا۔اکثرلوگ

آپؓ سے مسائل پوچھتے اور اطمینان حاصل کرتے۔ آپؓ سے ۶۵/احادیث مروی ہیں جنہیں آپؓ نے حضورﷺ سے اور ام المومنین حضرت زینبؓ بنت خزیمہ سے روایت کیا ہے۔ آپؓ کا ایک مشہور قول ہے کہ میں نے رسول اللہﷺ کو فرماتے سنا ہے: ''جو شخص دن رات میں فرض نمازوں کے بعد ۱۲ رکعتیں سنت پڑھتا ہے اس کے لیے جنت میں گھر بنایا جاتا ہے۔'' پھر آپؓ نے فرمایا کہ حضورﷺ کا یہ ارشاد سن کر میں نے ان سنتوں کی ادائیگی میں کبھی ناغہ نہیں کیا۔ (صحیح مسلم)

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کو جب آفتاب حیات کے غروب ہونے کے وقت کا احساس شدید ہوا تو ازواج مطہرات میں سے جوان کی سوکنیں باحیات تھیں بلوایا اور فرمایا کہ: دیکھو ہم لوگ ایک دوسرے کی سوکنیں تھیں۔ ہر وقت ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ممکن ہے کہ ایک دوسرے کو کچھ کہنے سننے سے تکلیف پہنچی ہو، لہٰذا میں سب کو معاف کرتی ہوں اور خود معافی کی خواستگار رہوں۔ یہ سننے کے بعد سب لوگوں نے ان کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ یہ دیکھ کر انہوں نے فرمایا: رب العزت آپ لوگوں کو خوش وخرم رکھے جیسا کہ آپ نے مجھ کو خوش وخرم رکھا۔ کتنے اعلیٰ سیرت اور عمدہ اخلاق کی حامل تھیں آپؓ، ایثار وخلوص کا پیکر تھیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھی کو امہات المومنین کی زندگیوں پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ عمر مبارک کی ۷۳/منزل تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کا نورانی وجود عالم آب وگل سے نکل کر عالم نور ونکہت کی جانب پرواز کرنے کے لیے بے چین تھا۔ آپ کے سن وفات کے بارے میں اقوال مختلف فیہ ہیں۔ راجح قول یہ ہے کہ اپنے بھائی حضرت امیر معاویہؓ کے عہد خلافت ۴۴ھ میں واصل بحق ہوگئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی تدفین مدینہ منورہ میں ہوئی۔ البتہ کس جگہ استراحت فرما ہیں، اس کی کوئی ٹھوس روایت نہیں ملتی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت علی ابن حسین ابن علی المرتضیٰؓ کسی ضرورت کے تحت اپنے مکان کے ایک گوشہ میں گڈھا کھودوا رہے تھے، اس میں ایک پتھر نکلا جس پر لکھا ہوا تھا ''ھذا قبر رملة بنت صخر '' یہ رملہ بنت صخر کی قبر ہے۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ کی قبر امیر المومنین حضرت علیؓ کے مکان میں تھی۔ جو بعد میں پوتے حضرت علی زین العابدینؓ کی ملکیت میں رہا ہے۔ اس روایت کے تناظر میں آپ کا مدفن گنبد خضرا کے شمال جانب بیت فاطمہ الزہراؓ میں واقع ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کاش آج کی خواتین امہات المومنین کی زندگیوں کا مطالعہ کرتیں اور اسے اپنے لیے اسوہ بناتیں تو ان کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جاتی۔

حوالہ جات

۱۔سیرت النبیؐ	ابن کثیر (اردو ترجمہ)
۲۔سیرت النبیؐ	علامہ شبلی نعمانیؒ
۳۔سیر الصحابہ	مولانا سید سلیمان ندویؒ (اردو ترجمہ)
۴۔الرحیق المختوم	مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری
۵۔ازواج مطہرات	حافظ افروغ حسن
٦۔سیر الصحابیات	مولانا سعید انصاری
۷۔نبی کریم ﷺ کی عائلی زندگی	حافظ محمد سعد اللہ
۸۔امہات المومنین	انوار احمد اعظمی خیر آبادی (۳٦٦)

●✿●

مولانا محمد ایوب اصلاحی کا سانحۂ ارتحال
(1928ء-2018ء)

مولانا محمد طاہر مدنی، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے قدیم استاذ مولانا محمد ایوب اصلاحی 30 جون 2018 کو دہلی میں اس دارِفانی سے کوچ کر گئے، إنّا لله و إنّا إليه راجعون ۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی خدمات کو قبول کرے، آمین۔

مرحوم اعظم گڑھ کے مشہور گاؤں کونڑہ گھنی کے رہنے والے تھے، اِدھر ایک عرصے سے صاحبِ فراش تھے اور دہلی میں اپنے صاحبزادے جناب ابوطلحہ اصلاحی کے پاس رہتے تھے جنہوں نے ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

مرحوم کی ولادت 1928 میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی، اس کے بعد 1940 کے اواخر میں مدرسۃ الاصلاح کے مکتب میں داخل ہوگئے اور 1951 میں فارغ ہوئے۔ ان کے ساتھ فارغ ہونے والے مولانا شہباز اصلاحی مرحوم تھے جنہوں نے مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

مرحوم نے جس زمانے میں مدرسۃ الاصلاح سے استفادہ کیا وہ انتہائی فاضل اساتذہ کا دور تھا، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی، مولانا مشتاق احمد اصلاحی، مولانا قمرالزماں اصلاحی اور مولانا مصطفیٰ ندوی علیہم الرحمہ جیسے اساطین مسندِ تدریس پر جلوہ افروز تھے۔ اس دور میں اساتذہ وطلبہ کے درمیان بہت گہرا ربط تھا اور ادارے کی فضا خالص علمی وروحانی تھی۔ مولانا اختر احسن اصلاحی رحمہ اللہ جیسے شیدائے قرآن اور نمونۂ سلف کی سرپرستی وسربراہی نے پوری فضا کو نورانی بنا رکھا تھا۔ مرحوم کو مولانا

اختر احسن اصلاحی صاحب کے داماد ہونے کا بھی شرف حاصل تھا، یقیناً اس کی وجہ سے انہیں مولانا سے مزید استفادے کا موقع ملا ہوگا۔ ایک اتفاق کی بات یہ ہے کہ والدِ محترم مولانا صغیر احسن اصلاحی علیہ الرحمہ کی ڈائری میں یہ بات درج ہے کہ 1958 میں مولانا اختر احسن اصلاحی کا انتقال ہوا اور نمازِ جنازہ والدِ محترم نے پڑھائی اور مدرسے کے قریب قبرستان میں تدفین ہوئی، میرا سنِ پیدائش بھی 1958 ہی ہے۔

مولانا محمد ایوب اصلاحی مرحوم فراغت کے بعد ہی مدرسے سے وابستہ ہو گئے اور تدریس وتربیت کا کام انجام دینے لگے۔ یہ وابستگی 2011 تک قائم رہی، بہت طویل عرصہ، 10 سال بحیثیتِ طالب علم اور 60 سال مربی واستاذ کی حیثیت سے...... پورے 70 برس کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔

میں 1973 میں عربی سوم میں داخل ہوا، مرحوم اس وقت عربی اول اور دوم میں گھنٹیاں لیتے تھے، اس لیے براہِ راست استفادے کا موقع نہیں ملا، تاہم ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی حفظہ اللہ سے عربی پنجم میں دیوان الحماسۃ پڑھنے کا موقع ملا، دوسرے صاحبزادے برادرم راشد ایوب اصلاحی میرے سینئر تھے۔ بعد میں مرحوم نے تفسیر اور ادب کا درس ایک عرصے تک اوپر درجات کے طلبہ کو دیا اور شاگردوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو مستفید کیا۔

مرحوم کے اندر بڑی سادگی اور قناعت تھی، اور انتہائی جانفشانی کے ساتھ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیا۔ گفتگو بہت دلکش کرتے تھے، کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی فارسی آمیز اُردو۔ مزاج میں خشکی نہیں تھی، اس لیے مجلس پُرکشش ہوتی تھی۔ میرے والدِ محترم 1949 میں فارغ ہوئے تھے، مولانا سے کچھ سینئر تھے، میرے ساتھ مولانا بڑا مشفقانہ سلوک کرتے تھے۔ بہترین مدرّس، کامیاب مربی، اچھے خطیب کے ساتھ عمدہ صاحبِ قلم بھی تھے، اچھا ادبی ذوق تھا اس لیے تحریر دلکش ودلپذیر ہوتی تھی، کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا وہ بہت خوب ہے، ان کے لائق صاحبزادے جناب ابوطلحہ اصلاحی ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ ''متاعِ قلم'' کے نام سے مرحوم کے ادب پاروں، شذرات اور مضامین کو البلاغ پبلی کیشنز سے شائع کر دیا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 2017 میں شائع ہوا جو 462 صفحات پر مشتمل ہے، ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی مرحوم کا گرانقدر مقدمہ بھی اس کی زینت ہے۔

سہ ماہی ''نظام القرآن'' کے شذرات میں مرحوم حالاتِ حاضرہ پر بہت جامع تبصرہ کرتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ ملکی وعالمی حالات پر بہت گہری تھی، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

''آج اس سرزمین پر جو معاشرہ موجود ہے خواہ وہ ترقی یافتہ دنیا کا ہو یا ترقی پذیر

دنیا کا، اعلیٰ اخلاقی کردار سے محروم ہے۔ سماجی برائیاں اس کے رگ وریشے میں سرایت کرگئی ہیں۔ وہ بنیادی انسانی قدریں جو شائستہ اقوام میں مسلّمات کا درجہ رکھتی تھیں ختم ہوتی جارہی ہیں۔ انانیت کا بول بالا ہے، خواہ وہ شخصی ہو یا قومی ونسلی۔ نہایت تیزی کے ساتھ خاندانی نظام بکھر رہا ہے۔ اس لیے اس کی اعلیٰ روایات دم توڑ رہی ہیں۔ تہذیب کی اولین درسگاہیں سنسان یا معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ دولت واقتدار کی ہوس ہر دل ودماغ پر مسلط ہے۔ اس لیے ہر جگہ اور ہر موڑ پر غیر عادلانہ ترجیحات نظر آئیں گی، اور پھر ظلم، جبر اور چیرہ دستی کے مظاہر دکھائی دیں گے، استحصالی ذہنیت کے مناظر نظر آئیں گے۔ اگر ٹھنڈے دل سے انسدادِ دہشت گردی کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کیا جائے اور ہر طرح کی معقول تدابیر روبہ عمل لائی جائیں تو شاید زیادہ مؤثر، کارگر اور متوازن ثابت ہوں اور ان کے خوش گوار نتائج برآمد ہوں۔'' (متاعِ قلم ص ۱۹۶، ۱۹۷)

''عالمی سطح پر اِس وقت امریکہ پر جنون کا دورہ پڑا ہے، پاگل ہاتھی کی طرح کبھی افغانستان کو روندتا ہے تو کبھی عراق کی سرحدوں پر چنگھاڑتا ہے۔ پوری دنیا میں وہ جنگل کا راج قائم کردینا چاہتا ہے۔'' (ایضاً ص ۲۲۵)

مولانا کا اسلوبِ نگارش سلیس اور مؤثر ہے، ایک نمونہ ملاحظہ کریں:

''اِس امت کو خیرِ امت بن کر رہنا ہے۔ اس کا منصب انسانیت کی خدمت ہے۔ اس کا مشن امنِ عالم اور انسانیت سے محبت ہے۔ اس لیے اسے ایک فعال کردار ادا کرنا ہے۔ اس اہم فریضے کی ادائیگی کے لیے یقیں محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کا مصداق بن کر عالمی اسٹیج پر نمودار ہونا چاہیے۔'' (ایضاً ص ۲۱۴)

مرحوم کا ادبی ذوق بہت عالی تھا، مجموعے میں ادبی نگارشات بھی شامل ہیں، شاعری کا بھی نمونہ ہے۔ ادارے سے 70 سالہ وابستگی کے بعد جب 2011 میں مفارقت کا زخم جھیلا تو دل کے جذبات کی عکاسی بہ شکلِ اشعار کی، یہ نظم ''صبح نو تا شامِ غم'' کے نام سے مجموعے کے آخر میں شامل ہے، چند اشعار ملاحظہ کریں:

کھلی جو آنکھ تو صبحِ حسیں تھی محوِ خرام
کرن کرن میں تھی ڈوبی ہوئی وہ خوش اندام
گلے سے لگ کے وہ ایسے لپٹ گئی مجھ سے
حیات پاکے مجھے جوں چمٹ گئی مجھ سے
گماں تھا شمعِ فروزاں رہے گی تا بہ ابد
حیات یونہی درخشاں رہے گی تا بہ لحد
ہر ایک صبح کی ہوتی ہے شام، شامِ غم
خزاں بہار کو چھوتی ہو جیسے آخرِ دم
مرے حسین تھے لمحات، مسکراتے ہوئے
چلے ادب سے بہت، ہاتھ کو ہلاتے ہوئے
مری حیات اندھیروں کے اب حصار میں ہے
سرور وکیف کی منزل کہیں غبار میں ہے

(ایضاً ص۴۶۱،۴۶۲)

طویل وابستگی، قلبی لگاؤ اور بے پناہ محبت کے بعد جدائی کا جو غم ہوتا ہے، وہ اس نظم میں بہت مؤثر اورمحسوس شکل میں جھلک رہا ہے، شاعر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی وارداتِ قلبی کو قارئین کا احساس بنادیتا ہے، یہ فن پوری کامیابی کے ساتھ اس نظم میں جلوہ گر ہے۔

مرحوم تحریکِ اسلامی کے بہت قدرداں تھے۔ تحریک سے رکنیت کی وابستگی تو نہیں رہی، لیکن اس کے پروگراموں میں شرکت اوراس کی سرگرمیوں سے تعلق ایک رکن ہی کی طرح رہا۔

مولانا کے چاروں صاحبزادوں نے مدرسۃ الاصلاح سے کسبِ فیض کیا۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی علم وتحقیق کی دنیا کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ آپ نے مدرسۃ الاصلاح اور ندوۃ العلماء سے کسبِ فیض کیا، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے، اور لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ مدرسۃ الاصلاح میں تین سال تدریس سے وابستہ رہے، چند ماہ علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی تدریسی فرائض انجام دیے، پھر مدینہ منورہ کی معروف اسلامی یونیورسٹی ''الجامعۃ الاسلامیۃ'' چلے گئے اور وہاں بارہ سال تک تدریس سے منسلک رہے۔ مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق کے رکن

ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور محقق ہیں۔ اِس وقت مجمع الفقہ الاسلامی، مکہ مکرمہ کے تحت علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کی کتابوں کی تحقیق میں مصروفِ عمل ہیں۔

دوسرے صاحبزادے جناب محمد راشد ایوب اصلاحی نے مدرسۃ الاصلاح کے بعد مدینہ یونیورسٹی سے کسبِ فیض کیا۔ اس کے بعد سے لندن میں تدریسی ودعوتی امور سے جڑے ہوئے ہیں۔

تیسرے صاحبزادے جناب ابوطلحہ اصلاحی اِس وقت دہلی میں ''البلاغ پبلی کیشنز'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ انتہائی کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں، جس سے اب تک بے شمار علمی وتحقیقی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

چوتھے صاحبزادے جناب ابوہریرہ اصلاحی جامعۃ الطیبات، طویٰ میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

صاحبزادوں کی علمی وتحقیقی دنیا سے وابستگی مولانا مرحوم کی بے مثال تربیت کی آئینہ دار ہے۔

مولانا عمرِ عزیز کے 90 برس گزار کر 30 جون 2018 کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے، یکم جولائی کو بعد نمازِ ظہر 2 بجے آبائی گاؤں کونرہ گہنی میں تدفین ہوئی۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، عظیم خدمات کو قبول کرے اور متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔

مولانا مطیع اللہ فلاحی!

ڈاکٹر امتیاز وحید، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو کلکتہ یونیورسٹی
موبائیل نمبر: 08583870891

فلاح مرحوم کی زندگی کا عنوان تھا، جو جلی حروف میں ان کی ترجیحات سے عبارت تھا۔ وہ اس ادارے سے سائے کی طرح چمٹے رہے اور فلاح ان کا سائبان بنا رہا۔

جامعة الفلاح میں تعلیم اور تربیت پر جو ٹیم تعینات تھی، اس میں مولانا مطیع اللہ صاحب کی حیثیت مسلم تھی۔ ۱۹۸۶ میں فلاح میں داخلے کے ساتھ ہی ہم ان کی باغ و بہار شخصیت سے واقف ہو گئے تھے۔ یہ واقفیت قربت اور پھر حد درجہ احترام اور استادی و شاگردی کے اٹوٹ رشتے میں بندھتی چلی گئی۔ مولانا کی شخصیت کا خمیر فلاح کی مٹی سے اٹھا تھا۔ یہیں سے تعلیم و تربیت پائی تھی، یہیں مدرسی کی اور پھر یہیں کے ہو رہے، ایسے کہ اب یہیں کی خاک میں سو رہے ہیں۔

مولانا مطیع اللہ صاحب فلاح کے اوّلین فارغین میں سے تھے۔ ۱۹۶۴ میں فلاح میں عربی کے چار درجات جب شروع ہوئے تو ان کا داخلہ عربی دوم میں ہوا۔ عربی اوّل وہ جامعۃ الرشاد سے مکمل کر کے آئے تھے۔ مرحوم عربی دوم میں مولانا محمد عمران فلاحی صاحب کے ہم جماعت تھے۔ انھوں نے ایک ساتھ فضیلت کی اور فلاح میں تدریسی خدمات پر مأمور ہو گئے۔ فلاح سے فراغت اور ایک سال کی تدریسی خدمات کے بعد مولانا مطیع اللہ صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ چلے گئے، جہاں سے انھوں نے کلیۃ الدعوہ میں بی اے کی ڈگری لی اور مزید دو سال مدینے میں گائڈ کی حیثیت سے کام کیا۔ اس طرح چھ سال بعد وہ مبعوث ہو کر پھر فلاح واپس آئے اور درس و تدریس میں جٹ گئے۔ تدریسی خدمات کے ساتھ انھیں نگرانِ اعلیٰ کے منصب پر بھی کام کرنے کا موقع ملا اور وہاں بھی مرحوم نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

فلاح میں نگرانی ایک حساس شعبہ ہے، جس میں کوئی اپنی مثالی کارکردگی کا دعوی نہیں کرسکتا اور یہ اس دور کی بات ہے جب فلاح درودیوار اور چہاردیواری سے بے نیاز محض ایک روایتی نوعیت کا مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ ایسے میں نظم وضبط کو یقینی بنانا یقیناً دشوار مرحلہ تھا۔ لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس وقت طلبہ میں نظم وضبط کی حرمت باقی تھی اور ہم اس احساس سے بے نیاز تھے کہ ہمیں نظم وضبط کا پابند رکھنے کے لیے چہاردیواری بھی کوئی ناگزیر چیز ہے۔ فلاح میں آج کی نسلِ نو کے پاس جبکہ ایک غنیمت فصیل نما دیواریں ہیں اور فلاح بیرونی حشو وزائد سے کسی قدر محفوظ ہے، تو ایسے میں انھیں اپنی داخلی ضابطہ داری کو ہمارے زمانے کے نظم وضبط کے مدِّ مقابل رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ سب کچھ آئینہ ہوجائے گا اور پھر انھیں ہمارے مولانا مطیع اللہ صاحب جیسے استاذ کے نظامِ نگرانی کی قدر و قیمت کا درست اندازہ ہوگا۔ نگرانی کے سیاق میں مرحوم کی مثالیت کا ایک توانا پہلو خودان کا وسائل سے تہی دامن عہد ہے، جس میں مرحوم اپنی ذمے داریوں سے بخوبی گزرے اور دامن بچالے گئے۔

فلاح میں مولانا مرحوم کی حصولیابیاں قابل قدر ہیں۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کے دورِ صدارت میں مرحوم فلاح میں نائب صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ مولانا رحمت اللہ الاثری صاحب کی صدارت اور مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب کی صدارت کے ابتدائی دور میں انھیں ناظمِ امتحان کی ذمے داری تفویض کی گئی تھی۔ علاوہ ازیں جامعۃ الفلاح میں بسوں کے نظم وانصرام میں مولانا کا سرگرم تعاون حاصل رہا۔ فلاح کے بچوں کے لیے مٹی تیل اور شکر کے کوٹے کے حصول میں مرحوم نے کلیدی کردار ادا کیا۔ فلاح کی مرکزی لائبریری میں بہت سی نایاب کتابیں تحفتاً فراہم کرائیں اور وہ سب کچھ کیا جس کی توقع کسی ادارے کے ایک کمیٹیڈ سپوت سے کی جاسکتی ہے۔ مادرِ علمی کے وقار اور اس کی ترقی کے تناظر میں غالباً مرحوم کو اپنے استاذانہ رول سے زیادہ ایک لائق فرزند کے فرائض یاد تھے، جس کی ادائیگی میں وہ ہمیشہ فائز المرام رہے۔

مولانا مطیع اللہ صاحب کا خاندان ضلع سدھارتھ نگر کے 'بیڑی بزرگ' اور 'سلون جوت' گاؤں تحصیل اِٹوا میں دو جگہوں پر آباد تھا، جہاں ان کی زمینداری تھی۔ مولانا سلون جوت میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم وتربیت بھی پائی۔ مولانا کے والد ماجد جناب قدرت اللہ صاحب رکن جماعت تھے اور پرائمری کے استاد تھے۔ دو بھائی اور ایک بہن میں مولانا سب سے چھوٹے تھے۔

فلاح مرحوم کی زندگی کا عنوان تھا، جو جلی حروف میں ان کی ترجیحات سے عبارت تھا۔ وہ اس

ادارے سے سائے کی طرح چمٹے رہے اور فلاح ان کا سائبان بنا رہا۔ اپنی تعلیم کی طرح انھوں نے اپنے تمام بچوں کو فلاح سے تعلیم دلوائی اور بلریا گنج ہی میں مقیم ہو گئے۔ معاشی تونمندی کے لیے اوّلاً بلریا گنج کی مارکیٹ میں سلائی مشین کی ایجنسی لی جو رفتہ رفتہ کتابوں کی دکان میں منتقل ہو گئی۔ تمام بچوں کی شادی وہیں کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مولانا مرحوم کے والد صاحب بھی یہیں آ گئے تھے۔ بہن بھی آ گئی تھیں۔ اب یہ سبھی مولانا کی طرح یہیں مدفون ہیں۔

مولانا مرحوم مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے۔ مولانا محمد عمران فلاحی صاحب نے مرحوم کے اس پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ 'انکار' کو ان کے مزاج سے بیر تھا۔ کسی کام کے لیے بھی ان سے کہا جائے وہ ہر آن تیار پائے جاتے تھے۔ کوئی اسٹیج ہو، کوئی جگہ ہو، کوئی موسم اور وقت ہو، آپ ان سے کسی موضوع پر تقریر کی فرمائش کریں وہ بلا تکلف بغیر کسی تیاری کے محض اپنے اعتماد اور حافظے کے سہارے تقریر کر گزریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے فلاح کی مسجد میں جمعہ کو بارہا انھیں کسی تامل کے بغیر تقریر کرتے ہوئے پایا۔ اس طرح مرحوم آڑے وقت کے ساتھی اور رفیق تھے۔ اس کی اہمیت وہی لوگ بخوبی سمجھ پائیں گے، جو نظم و انصرام میں قحط الرجال کے مارے ہوتے ہیں۔ مولانا اپنی اسی خوبی کی بنا پر ہمیشہ بیش قیمتی خیال کیے جاتے تھے۔

مرحوم مولانا مطیع اللہ صاحب وضع قطع میں ایک روایتی مولوی کی شان سے متصف تھے۔ چوڑی مہری والا پائجامہ، قمیص اور سر پر کشتی نما ٹوپی، ان کی کل کائنات تھی۔ سادگی اور دردمندی مرحوم کی سیرت کی دو نمایاں خوبیاں تھیں کہ جن سے تحریک پا کر عام طلبہ ان سے بے خوف گھل مل جایا کرتے تھے۔ عام اور ہاؤ بھاؤ سے یکسر بے نیاز ان کی ذات عام طلبہ کے لیے سبیل کا درجہ رکھتی تھی۔

مولانا ایک ظریف الطبع انسان تھے۔ مرحوم سے ملاقات کی چند ہی ساعتوں میں آپ بخوبی جان لیتے کہ وہ طبعاً حیوانِ ظریف ہیں۔ طالب علمی کے دور میں ان کی طبیعت کا رنگ تو یقیناً اور گہرا رہا ہوگا البتہ ہم نے مولانا کو ہمیشہ ہشاش و بشاش، ہنستے مسکراتے ہی دیکھا بلکہ چلتے پھرتے اشعار موزوں کرتے بھی پایا ہے۔ طبیعت کی موزونیت انھیں تک بندی پر بھی اکساتی تھی۔ کسی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ 'میں ہوں ندیم'، مولانا کا جواب آیا 'تو پھر کیوں نہ ہیں آپ عدیم؟' ہمارے ہم سبق سمیع اللہ فلاحی (کوہنڈہ) نے مولانا سے اعظم گڑھ جانے کے لیے چھٹی کی استدعا کی، مرحوم نے معلوم کیا کہ کیا بات ہے؟ سمیع اللہ نے کہا کہ ''آنکھ دکھانا ہے''، مولانا نے جھٹ فرمایا ''کسی کو آنکھ دکھانا بالکل غلط بات

ہے!''۔

مولانا کا تدریسی طریقہ بڑا نرالا تھا۔ طربیہ اندازِ تدریس میں وہ پوری جماعت کو باندھے رکھتے تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ عبارت کے معنوی دروبست کو کھنگالنے اور اس کے نحوی اور صرفی تعین قدر کے پھیرے میں ہماری جماعت نے سال بھر مشکوٰۃ کے محض چار صفحات ہی پلٹے، مولانا کو ایسے الجھائے رکھا کہ پانچویں صفحے کی نوبت نہیں آنے دی۔ لیکن مولانا بھی پختہ کار اللہ والے انسان تھے، امتحان میں سوالات پورے نصاب سے پوچھے گئے تھے۔ مولانا کے نہجِ تدریس سے کسی کو عدمِ اتفاق تو ہوسکتا ہے تاہم وہ محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولانا نے غالبًا زندگی کی ناہمواریوں کا سامنا اس قدر قریب سے کیا تھا کہ وہ خود طرب ونشاط کی سرحد کو چھوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ انھیں عربی بول چال کی زبان سے اچھی واقفیت تھی۔ موڈ میں ہوں تو مرحوم فراٹے دار عربی میں بھی بولتے چلے جاتے تھے۔ ظرافت یہاں بھی ان کے نطق سے چمٹی رہتی تھی۔

درس وتدریس سے وابستگی کے معاً بعد مولانا مرحوم بلریا گنج میں کرایے کے مکان میں رہنے لگے تھے۔ قناعت اور اپنے فرض سے ایماندارانہ وابستگی نے مدارس سے وابستہ دیگر پاک نفوس کی طرح ان کی داخلی اور روحانی قوت کو اتنا بلند کردیا تھا کہ مبلغ ۸۰؍روپے کی ماہانہ تنخواہ میں کرایے کے پندرہ روپے منہا کرنے کے بعد بھی وہ بخوشی گزارہ کرلیا کرتے تھے۔ مدینہ سے مبعوث ہونے کے بعد البتہ راحت ملی، تو پھر فلاح سے متصل نوآباد فلاحی کالونی میں زمین لے کر اپنا گھر بنایا۔

مدینے سے مبعوثیت کی مدت جب ختم ہوگئی تو غالبًا اپنی عام مقبولیت کے سبب مولانا فلاح کے نئے payroll پر دفتر نظامت سے متعلق 'شعبہ رابطہ عامہ' میں منتقل کردیے گئے تھے۔ تاحیات درس وتدریس سے وابستہ فلاح کے ایک سچے خادم کے لیے یہ بہرحال کوئی خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔ لیکن فلاح سے نصف صدی کی وابستگی نے تنخواہ اور منصب میں اس فروتنی کو بھی قبول کرلیا اور وہ خدمت پر مأمور کردیے گئے، تاہم خدمت کا یہ عرصہ دیر پا نہ رہا اور وہ دو سال بعد ہی وہاں سے بھی سبکدوش کردیے گئے۔ مولانا مرحوم ان پاک طینت نفوس میں سے تھے جنھیں ہر حال میں راضی بہ رضا دیکھا گیا۔ مولانا نے پوری زندگی فلاح کی نذر کردی اور کبھی اپنا دل میلا نہ کیا بلکہ آزمائش کی مشکل ترین ساعت میں بھی وہ فلاح کی پالیسی کے ساتھ کھڑے فلاح کا گن گان کرتے رہے۔

مولانا کی ذات دراصل ایک داعی کی ذات تھی۔ فلاح سے چھوٹے تو وہ جماعت اسلامی کے ناظم

علاقہ کی حیثیت سے ایک نئے کردار میں، اپنے دعوتی فریضے کی ادائیگی میں منہمک ہوگئے تھے اور اسی حیثیت میں مورخہ ۳۰/اپریل ۲۰۱۸ کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم کی زندہ خوبیوں کا اعتراف فلاح سے وابستہ سبھی افراد کو ہے۔ زندگی کی تلخیوں کو ہنس کر گوارا کرنے کا ہنر تو ہم نے انہی سے سیکھا ہے۔ ایسے میں مرحوم کے شاگرد اپنی جملہ کامرانیوں کا سہرا اپنے اساتذہ کے سر باندھتے ہیں تو بھلا اس میں شک کی کیا گنجائش ہے۔ مولانا مرحوم اپنی ہر ادا میں فلاح کے سچے عاشق نکلے اس طرح کہ بقول غالبؔ ؎

فارغ مجھے نہ جان، کہ مانندِ صبحِ مہر
ہے داغِ عشق، زینتِ زیبِ کفن ہنوز

نایاب خطوط

ذیل میں معروف داعی مولانا نسیم غازی فلاحی صاحب کا وہ اہم اور قیمتی خط شامل اشاعت کیا جارہا ہے، جو موصوف نے گزشتہ دنوں تبلیغی جماعت کے ذمہ داران کے نام تحریر کیا تھا۔ توفیق خداوندی شامل حال رہی تو اس کالم کے تحت آئندہ بھی اہم اور نایاب خطوط کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا رہے گا۔ **(مدیر)**

بسم اللہ

تبلیغی جماعت کے ذمے داران سے گزارش

محترمی و مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

یہ خط ایک اہم بات کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ لوگ اس پر ضرور غور کریں گے۔

محترم! ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ کچھ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو نماز تک پڑھنے سے روک رہے ہیں اور اس کے خلاف نفرت پیدا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ یہ مذموم حرکت چاہے جس وجہ سے بھی کر رہے ہوں، لیکن اس کا ایک اہم سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے غیر مسلم بھائی نہیں جانتے کہ اذان اور نماز کیا ہے؟ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کے فائدے کیا ہیں اور مسلمان نماز کیوں پڑھتے ہیں۔

تبلیغی جماعت جو خدمت انجام دے رہی ہے اس سے سب لوگ واقف ہیں۔ خاص طور سے نماز کے سلسلے میں اس کا اہم رول ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تبلیغی جماعت اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کر لے تو اذان اور نماز کے سلسلے میں غیر مسلم بھائیوں کی غلط فہمیاں نہ

صرف دور ہوسکتی ہیں بلکہ انہیں دین حق کے قریب بھی لاسکتی ہیں۔اس سلسلے کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بار ایک غیر مسلم بھائی نے جوکہ اپنے علاقے کے باثر اور صاحب حیثیت آدمی تھے اور اسلام سے بہت متأثر تھے،انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہماری بستی میں تبلیغی جماعت کے لوگ بڑی پابندی سے آتے ہیں۔وہ صرف مسلم گھروں میں جاتے ہیں اور ان سے کھڑے کھڑے چپکے چپکے کچھ باتیں کرتے ہیں۔اور پھر کسی وقت سب کو مسجد میں جمع کرتے ہیں اور وہاں پر بھی ان سے نہ جانے کیا باتیں کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔

ان غیر مسلم بھائی نے مجھ سے کہا کہ ہم ہندو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ چپکے چپکے ہمارے خلاف کچھ باتیں کرتے ہیں اور پھر مسجد میں بلا کر ہمارے خلاف کچھ باتیں سمجھاتے ہیں۔انہوں نے مزید فرمایا کہ ایک روز میں نے تبلیغی جماعت کے لوگوں سے اپنے اشکالات کا ذکر کرڈالا تو انہوں نے اپنی سرگرمیوں کی حقیقت مجھے بتائی، جسے سن کر میں بہت حیرت زدہ ہوا۔میں نے ان سے کہا کہ آپ کی ان باتوں میں ایسی کون سی بات ہے جو مسلمانوں کے فائدے کی تو ہو مگر غیر مسلموں کے فائدے کی نہ ہو۔آپ لوگوں کو چاہیے کہ غیر مسلم لوگوں کو بھی اسلام کے بارے میں بتائیں۔

محترم! میں نے صرف ایک واقعہ تحریر کیا ہے صرف اس لیے کہ صورتحال اور غیر مسلم بھائیوں کی سوچ اور نفسیات کا ایک عکس ہمارے سامنے آسکے۔میں آپ حضرات کی خدمت میں چند گزارشات پیش کررہا ہوں۔امید ہے آپ اس پر غور کریں گے اور اگر مفید پائیں تو عملی جامہ پہنائیں گے۔(وباللہ التوفیق)

(۱)تبلیغی جماعت کے احباب جب کسی بستی یا کسی مقام پر گشت کے لیے جائیں تو وہاں صرف مسلمانوں ہی سے ملاقات نہ کریں بلکہ اگر غیر مسلم بھائی کا کوئی گھر یا دوکان درمیان میں پڑے تو ان سے بھی ملاقات کریں۔البتہ غیر مسلم بھائیوں کو مختصراً ان کے خالق مالک اور پروردگار کے بارے میں بتائیں،ان سے والدین اور دیگر لوگوں کی خدمت اور اچھے اخلاق اپنانے کی گزارش کریں۔

(۲)غیر مسلم بھائیوں کو اذان اور نماز کا مطلب بتائیں۔راقم نے غیر مسلم بھائیوں کے

سامنے اذان اور نماز کے تعارف اور اس کا مطلب بیان کرنے کے لیے ہندی اور انگریزی میں ایک مختصر سا کتابچہ ''اذان اور نماز کیا ہے؟'' کے نام سے میں نے شائع کرایا ہے۔میری گزارش ہے کہ تبلیغی جماعت کے احباب اس کتابچے کو غیر مسلم بھائیوں تک پہنچائیں اور انہیں بتائیں کہ ہم جس نماز کی تلقین مسلمانوں کو کرتے ہیں اس کے معنی اور مطلب جاننے کے لیے اس کتابچے کو پڑھیں۔

اگر ایسا کریں گے تو ان شاءاللہ آپ حضرات اس کے نہایت مثبت اور حیرت انگیز نتائج اپنی انکھوں سے دیکھیں گے۔ایسی ہمیں امید ہے۔

اس کتابچے کی چند کاپیاں آپ کی خدمت میں بھیجی جارہی ہیں۔

والسلام

نسیم احمد غازی فلاحی

مدھر سندیش سنگم

پوسٹل ایڈریس:

E-20 ابوالفصل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی 110025

8800454492

نعت پاک

ثنا خواں رحمت للعالمیں کا ہے جہاں سارا
فنا جس نے کیا تاریکیوں کا کارواں سارا
نبی کی مدح کرنا ہے تقاضا دین وایماں کا
فزوں تر ہوتا ہے اس سے مرا عزم جواں سارا
نبی کے ذکر سے دل کو سرور وکیف ملتا ہے
غم وآلام کا ڈھ جاتا ہے کوہِ گراں سارا
شب معراج میں جب آپ پہنچے آسمانوں پر
امنڈ آیا برائے خیرمقدم لامکاں سارا
پیام سرورعالم کو پھیلا کر ذرا دیکھو
یقیناً ختم ہوجائے گا نفرت کا دھواں سارا
عداوت، قتل وخونریزی کا دنیا پر تسلط تھا
حضور آئے تو عالم ہوگیا جنت نشاں سارا
رسول اللہ کے اصحاب کی قسمت کا کیا کہنا
جہاں بھی ہے انہی کا اور ہے باغ جناں سارا
ملی جب سے سعادت مجھ کو نعت پاک لکھنے کی
منور ہر گھڑی رہنے لگا میرا مکاں سارا
محبت میں نبی کی استقامت شرطِ لازم ہے
تبھی ہٹ پائے گا اس راہ سے سنگ گراں سارا
ابوبکر وعمر، عثمان وحیدر سا نہیں کوئی
انہی کے کارناموں سے فروزاں ہے جہاں سارا
زمین نعت میں آساں نہیں دادِ سخن دینا
دھرا رہ جاتا ہے عارفؔ یہاں زورِ بیاں سارا

احسان الحق عارفؔ آئمی

نعت

آقائے دو عالم کی عجب خوش قدَمی ہے
ہر ذرّۂ صحرا میں بڑی تازہ دَمی ہے

....

اے ربِّ سخن! بخش دے خیراتِ تخیّل
سرکار کی مدحت میں کھڑا اک عجمی ہے

....

وہ فاتحِ مکّہ، وہ سخاوت، وہ محبت
ہر آنکھ بس اک منظرِ حیرت پہ جمی ہے

....

آمد کی خبر کس کی ہے افلاک پہ روشن
کیوں انجم و مہتاب کی ہر سانس تھمی ہے

....

آقا نے تو ہر راہ دکھائی ہے خدایا!
جو کچھ بھی کمی ہے وہ مری اپنی کمی ہے

عزیز نبیل،قطر

غزل

بخشتی ہے قرب اپنا یوں بھی ویرانی مجھے
راس آتی ہے توحش کی فراوانی مجھے

مستقل رہتا ہے مجھ پر منعکس اک آئینہ
دیکھتی رہتی ہے پیہم ایک حیرانی مجھے

ختم ہو جاتا ہے یکدم عالمِ ناممکنات
گھیر لیتی ہے یکا یک موجِ امکانی مجھے

کیا کہوں دشوار کتنی ہیں مجھے ہمواریاں
کیا کہوں کیسی سہولت ہے پریشانی مجھے

اولاً اک آگ بھڑکائی گئی مجھ خاک میں
اور پھر دیکھا گیا ہوتے ہوئے پانی مجھے

رات دن رہتا ہوں میں آمادۂ رقصِ جنوں
محترم یوں ہی نہیں ہے پا بجولانی مجھے

کیا کیا جائے کہ رکھتی ہے اندھیروں کی غلام
بیشتر اوقات خود اپنی ہی تابانی مجھے

جی میں آتا ہے بجھا دوں ساری آنکھوں کے چراغ
جب دروں کی مضطرب کرتی ہے عریانی مجھے

ارشد جمال صارمؔ،
منصورہ طبیہ کالج، مالیگاوں

تعارف وتبصرہ

نقوش سیرت نبویؐ

مصنف: پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی

صفحات:۱۹۲، **قیمت**:۲۲۰/روپے

ناشر:اسلامک بک فاؤنڈیشن،نئی دہلی۔۲۵

مبصر:محمد اسعدفلاحی،نئی دہلی

دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ لکھا جانے والا موضوع سیرت نبویؐ ہے۔اس پر لاکھوں لوگوں نے اپنی تحریری جولانیاں دکھائی ہیں۔ان میں دنیا کے ہر خطہ، ہر مذہب، ہر ملک اور ہر زبان کے لوگ شامل ہیں۔گزشتہ چودہ صدیوں میں سیرتِ نبویؐ پر مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور ان شاءاللہ تا قیامت اس کا سلسلہ جاری رہے گا اور کیوں نہ ہو،سیرت نبویؐ،انسانوں کے لیے ایک کامل اورسدابہار نمونہ ہے۔آپؐ نے اپنی عملی زندگی سے انسانی زندگی کے ہر گوشے میں رہنمائی کی ہے۔

زیرنظر کتاب 'نقوش سیرت نبوی' کے مصنف ہندوستان کے معروف اسلامی اسکالر پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی ہیں۔ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ فاضل مصنف نے ملک وبیرون ملک میں منعقد مختلف سمیناروں اور کانفرنسوں میں سیرت رسول کے بعض گوشوں پر پیش کردہ مقالات کوافادۂ عام کی غرض سے مرتب کرکے تصنیف کی شکل دے دی ہے۔

اس کتاب میں سات (۷) مقالات شامل ہیں۔ان میں بالخصوص معاشی اور معاشرتی زندگی میں اسوۂ نبویؐ اور سیرت میں حقوق انسانی کی اہمیت جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ابتدائی دو(۲) ابواب میں علم کوموضوع بنایا گیا ہےاورعلم کی اہمیت، جامعیت اورضرورت وافادیت پرگفتگو کی گئی ہےاور بتایا گیا ہے کہ نفع بخش علوم سیکھنے کی طرف ترغیب دی گئی ہے اور غیر نافع علوم سے احتراز کا مشورہ دیا گیا ہےاوراس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے علم کا نفع بخش ہونا اس پرمنحصر ہے کہ وہ کس

حد تک اپنے مقاصد کو پورا کر رہا ہے۔ (ص۲۲) عہد نبویؐ میں رائج نظام تعلیم کا بھی تفصیل سے تعارف کرایا گیا ہے۔

اگلے دو ابواب (سوم و چہارم) معاشرت سے متعلق ہیں۔ ان میں اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کی روشنی میں آدابِ معاشرت کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا رہن سہن، آپ کا لوگوں کے ساتھ برتاؤ، صحابہ سے تعلقات و معاملات اور آپؐ کی روزمرہ کی زندگی کو صحیح احادیث کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ خانگی اور معاشرتی زندگی میں اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت مبارکہ سے جو رہنمائی ملتی ہے اسے بھی خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں مصنف نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے معاشی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ آپؐ کی معاشی مصروفیات کیا تھیں؟ تجارت میں لوگوں کے ساتھ آپؐ کے معاملات کیسے تھے؟ لین دین میں کن باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے؟ اور عصر حاضر کے معاشی مسائل کو آپؐ کی حیاتِ طیّبہ کی روشنی میں کیسے حل کیا جا سکتا ہے؟ ان تمام پہلوؤں پر فاضل مصنف نے اسوۂ نبویؐ کی روشنی میں مدلل بحث کی ہے۔

چھٹا باب 'خطبۂ حجۃ الوداع' کے موضوع پر ہے۔ یہ کتاب کا سب سے اہم اور قیمتی باب ہے۔ اس میں مصنف نے دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ خطبۂ حجۃ الوداع اصلاً حقوق انسانی کا عالمی منشور ہے۔ کوئی دوسرا منشور یا دستور اس سے بڑھ کر انسانی حقوق کو تحفظ دینے والا اور انسان کو عزت و احترام کے مقام پر فائز کرنے والا نہیں ہے۔ (ص۱۵۵)

کتاب کا آخری اور ساتواں باب 'اوراق سیرت' کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب معروف عالم دین مولانا سید جلال الدین عمری کی بیش قیمت تصنیف ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ کس طرح یہ کتاب سیرت کے موضوع پر ایک نایاب تصنیف ہے، جسے روایتی انداز میں تالیف نہیں کیا گیا، بلکہ مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین کو اس سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے کہ ایک مستقل اور مربوط تالیف بن گئی ہے۔ (ص۱۵۸)

کتاب میں حسب ضرورت ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں، جس سے قاری کو دوران مطالعہ میں کسی بات کو سمجھنے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ زبان سلیس استعمال کی گئی ہے اور بھاری بھرکم الفاظ اور جملوں کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے، جس نے کتاب کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ہر باب کے آخر میں حواشی درج ہیں۔ فاضل مصنف نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، آخر میں کتابیات

کے تحت ان کی فہرست درج کردی ہے۔

سیرت کے ذخیرے میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ اور سیرت رسول ﷺ کے ممتاز پہلوؤں، خاص طور پر آپ کی معاشی، معاشرتی اور سماجی زندگی کا ایک حسین گل دستہ ہے۔ امید ہے، علمی حلقوں میں اسے قبول عام حاصل ہوگا اور اس سے استفادہ کیا جائے گا۔

فکر

شاعر: اطہر اعظمی

صفحات:156، **قیمت**:200 روپے، **اشاعت**: 2016

ناشر: اطہر اعظمی، 341/19 اے گیٹ نمبر 5 مالونی، ملاڈ، ویسٹ ممبئی 95

مبصر: سعید اختر اعظمی

شعر گوئی کی بنیاد بہمنی سلطنت میں سولہویں صدی میں پڑی۔ شمالی ہند میں پہلا شعری مجموعہ 1722 میں منظر عام پر آیا جو ولی دکنی کا تھا۔ یہاں شعر گوئی کی ابتدا 1702 بتلائی جاتی ہے۔ بعد ازاں مختلف شعراء نے اس میدان میں اپنے فن کے جوہر دکھلائے۔ شاعری صرف گل و بلبل، رقص جام و مینا اور حلقہ زلف گرہ گیر کا نام نہیں، یہ تو حالات حاضرہ اور احوال من وتو کا اعلامیہ ہے۔ اطہر اعظمی اسی حوالے کو معتبر کرنے والوں میں سے ہیں۔ انھوں نے عام بول چال کے الفاظ اور سہل تراکیب کو اپنا کر اسے وقار بخشا ہے۔ ان کا ایقان ہے کہ وہی شاعری مقبولیت کی معراج پا سکتی ہے جو عام فہم ہو اور زبان زد خاص و عام بننے کی اہلیت رکھتی ہو۔

'فکر' اطہر اعظمی کا دوسرا سخن بیانیہ ہے جو تقریباً ایک صد غزلوں، منظومات وقطعات پہ مشتمل ہے۔ سلاست الفاظ کا سہارا لے کر انھوں نے بحسن وخوبی اپنے جذبات واحساسات کی ترسیل کی ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار پیش ہیں:

عشق دنیا نے غلط سمت فراہم کی ہے ۔۔۔ پھیر کر رخ مرا اب سوئے حرم لے آؤ

....

سزائے کفر میں جو قتل ہو گیا اطہر ۔۔۔ بوقت قتل وضو سے وہ جسم گیلا تھا

....

جب سے گلوں میں نقل کی آمیزشیں ہوئیں ۔۔۔ گلشن میں اصل رنگ کا منظر نہیں رہا

بھوک تھی نونہال کو، لیکن   ماماتا مطمئن تھی رونے تک

....

انگلیاں اٹھنے لگیں جب آپ کے کردار پر   اپنی خوبی سے اجاگر اُن کی خامی کیجیے

....

رعیت کی لگی ہے آہ جس کو   وہ شہزادہ بھکاری ہو گیا ہے

....

ہارنا تو ترا مقدر تھا   سچ نہیں، جھوٹ کو گواہ کیا

رومانی وفور کی کارفرمائی میں وہ دیگر شعراء سے پیچھے نہیں ہیں۔ اسے انھوں نے خوبصورتی سے لفظوں کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

دوری قربت سے بہتر ہے   میرا جو محبوب نہیں ہے

....

محور آرزو مر مریں ہے اگر   جذبہ عشق چاندنی کیجیے

....

ہونٹوں سے جام عشق لگانے کی دیر تھی   میزان زندگی کا ادب مل گیا انھیں

....

ادائے عشق منور جہان کردے گی   صنم کدوں میں اخوت اذان کردے گی

غزل کو عوامی اسلوب عطا کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کی لطافت وسلاست مجروح نہ ہو۔ یہاں ہندی تراکیب، نامانوس الفاظ، غیر فصیح وناموزوں آہنگ کے سبب ایسا ہی ہوا ہے۔ چند رنگ ملاحظہ ہوں:

بزم آداب دھماکوں سے لرز جانے دو   ذہن کی راہ سے اشعار کے بم لے آؤ

....

دوڑ سکتی ہے ترقی ملک میں   شاہراہوں کو ڈبل ہو جانے دو

....

پُر خطر ہے رہگزر تو ساودھانی کیجیے   جس جگہ پر ہو ضروری تیز گامی کیجیے

....

آپدا میں بن کے سیوک   بانچھ کیسے کھل گئی ہے

....

ہوتا ہے بغض کھیت کو جس طرح میڑ سے   یہ فن جوان سیکھیں ضعیف وادھیڑ سے

ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جو قرأت سخن کے دوران کوفت کا باعث بنتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ بیت غزل کی تعداد کم کر کے فضائے غزل کو بوجھل ہونے سے بچا لیا جاتا۔

مدیر کے نام

آپ کے خطوط

محمد دانش فلاحی، نئی دہلی

حیات نو ادھر چند ماہ سے پابندی کے ساتھ دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اہم موضوعات پر فلاحی برادران کی اہم اور قیمتی تحریروں سے بھرپور استفادہ کی کوشش کرتا ہوں۔ جولائی کے شمارے میں خواتین سے متعلق لائق مطالعہ تحریریں شائع ہوئی ہیں، انہیں خواتین کے درمیان عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مولانا ضمیر الحسن خاں فلاحی صاحب کی تحریر 'تہذیبی جارحیت اور اسلام' موضوع کا بھرپور احاطہ کرتی ہے اور جدید دنیا کے مسائل پر بھی اچھی رہنمائی پیش کرتی ہے، اس موضوع کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ اس وقت وطن عزیز اسی تہذیبی جارحیت کا بری طرح شکار بنا ہوا ہے۔

مدیر محترم جناب ابوالاعلی سید سبحانی صاحب کا سماجی تعلقات کی اسلامی بنیادوں پر اداریوں کا سلسلہ بہت ہی مفید ہے، اس سلسلے کی اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے، البتہ ماہ جولائی کے اداریے کو پڑھ کر کافی تشنگی محسوس ہوئی، ایسا لگا کہ بہت رواروی میں یہ اداریہ لکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے ماہ جون کے شمارے میں موصوف نے اس سلسلے میں بہت ہی بھرپور گفتگو کی تھی، ماہ جون کے اداریے کا اختتام دیکھیے، کتنے زبردست اور عملی قسم کے نکات پیش کرتے ہیں:

''سماجی تعلقات کے سلسلے میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اللہ رب العزت کا ابتلاء وامتحان کا پورا ایک نظام ہے، اس نظام کے تحت وہ بندوں کا امتحان لیتا ہے کہ کون اللہ رب العزت کو پہچانتے ہیں اور اس کی نعمتوں پر شکرگزار ہوتے ہیں اور کون اس کو پہچاننے سے انکار کرتے ہیں اور ناشکری کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ امت کے فرض منصبی کا یہ تقاضا ہے کہ بندوں کو رب سے وابستہ کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن ساتھ ہی انسانی بنیادوں پر ان کے ساتھ بہترین تعلقات بھی استوار رکھے جائیں۔ سماجی

تعلقات کے سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ قرآن مجید میں جو دعوتی روداد یں بیان ہوئی ہیں، اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مطالعہ کے دوران، کہیں نہیں ملتا کہ داعی فرد یا گروہ نے کبھی مخاطبین سے قطع تعلق یا دوری کا راستہ اختیار کیا ہو، قطع تعلق، مخالفت، بائیکاٹ اور دوری کا راستہ ہمیشہ دوسری جانب سے اختیار کیا جاتا ہے۔ ارادہ واختیار کی آزادی کا اعتراف خود بخود اس بات کو طے کردیتا ہے کہ مسلم معاشرے کے درمیان تمام ہی انسان مذہب، اور رنگ ونسل کی تفریق سے بالاتر ہوکر امن وسکون اور خوش گوار ماحول میں گزربسر کرسکیں گے۔ ہجرت مدینہ کے بعد آپؐ نے میثاق مدینہ میں اسی بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن یہود مدینہ اپنی حرکتوں کے نتیجے میں اس کو ناکام کرنے میں کامیاب ہوگئے، جس کی تفصیلات تاریخ وسیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔''

اس سلسلے میں صرف یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ اس وقت سماجی تعلقات کی بحث ملکی وعالمی سطح پر کافی آگے بڑھ چکی ہے، اس سلسلے میں مذاہب کی تعلیمات وہدایات کا مطالعہ اور تجزیہ بھی پیش کیا جارہا ہے، اور مختلف قسم کے اعتراضات بھی مذاہب بالخصوص اسلام پر کیے جارہے ہیں، حیات نو کے ذریعہ اس موضوع پر ایک خاص شمارے یا تفصیلی مضامین کا سلسلہ شروع کیا جانا چاہیے، جس میں عملی میدان سے وابستہ فارغین جامعہ مولانا نسیم احمد غازی فلاحی، مولانا محمد اسماعیل فلاحی، مولانا محی الدین غازی صاحبان وغیرہم سے خاص طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ امید کہ ادارت سے متعلق افراد اس پر توجہ دیں گے۔

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبہ اعلی، جامعۃ الفلاح

معمل اللغۃ کی کلاسز کا آغاز

۳۰/جون ۲۰۱۸ء بروز شنبہ جامعہ کے ایک اہم شعبہ معمل اللغۃ کی کلاسیز کا آغاز ہوگیا۔ جس میں عربی اول سے فضیلت تک طلبہ استفادہ کررہے ہیں۔ ناظم جامعہ جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب، مولانا ذکی الرحمٰن غازی فلاحی اور مصباح الباری کے علاوہ وقتی طور پر جناب مولانا شاہد کریم اللہ فلاحی (ریاض یونیورسٹی) اور عبدالرحمٰن طاہر فلاحی (مدینہ یونیورسٹی) اور جناب مولانا عارف سردار فلاحی صاحب (جامعۃ الصلاح، نصیر پور) بھی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

شیخ الجامعہ مولانا سید جلال الدین عمری صاحب کی تذکیر

۴/جولائی ۲۰۱۸ء بروز چہارشنبہ جامعہ میں مولانا سید جلال الدین عمری صاحب کی تذکیر ہوئی۔ آپ نے اپنی تذکیر میں فرمایا کہ اس وقت طلبہ عزیز جس دور سے گزررہے ہیں وہ زندگی کا سب سے قیمتی دور ہے۔ قیامت کے دن عام زندگی سے متعلق سوال تو ہوگا ہی، خاص طور پر نوجوانی سے متعلق سوال ہوگا، کہ جوانی کا زمانہ کن کاموں میں کس طرح کی مصروفیات میں صرف کیا تھا۔ اس لیے اس وقت کو بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان دنیا میں جو بھی کوشش کرتا ہے اس کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: **لیس للانسان الا ما سعی**۔ محترم امیر جماعت نے فرمایا کہ آپ نے دیگر اداروں کو چھوڑ کر اس جامعہ کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ اس پر غور کرتے رہنا چاہیے۔ بلکہ اگر موقع ملے تو جامعہ کے دستور کا ضرور مطالعہ کرلیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ جامعہ کے اغراض ومقاصد کیا ہے۔ جامعہ کس طرح کے افراد کو تیار

کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز آپ کی گفتگو کا موضوع ہونا چاہیے۔تاکہ آپ اسی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکیں۔اور عظیم مقاصد کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکیں۔

محترم امیر جماعت نے مزید فرمایا کہ پوری دنیا کے سامنے دین واسلام کو دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔تمام انسانیت کو یہ بتانا کہ یہی دین برحق ہے اوراسی کی پیروی میں دنیاوآخرت کی کامیابی مضمر ہے، ہمارے فرائض میں شامل ہے۔آج کل عام طور پر ہماری باتیں صرف مسلمانوں کے درمیان ان کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے۔غیر مسلموں کے درمیان بہت کم ہوتی ہے۔

محترم امیر جماعت نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوری تاکید کے ساتھ فرمایا کہ خوب خوب مطالعہ کی عادت ڈالیے۔نصابی کتابوں کے ساتھ ہم نصابی کتابوں کے مطالعہ کا اہتمام کیجئے۔یہ طے کر لیجیے کہ دینی اوراسلامی لٹریچر کے کم ازکم دس صفحات کا مطالعہ روزانہ کریں گے۔اس کے ذریعہ آپ کے علم میں پختگی بھی پیدا ہوگی،اورآپ کوایک رخ بھی ملے گا اور دین کی تبلیغ واشاعت اوراقامت کے لیے قربانی دینے کا جذبہ بھی فروغ پائے گا۔

جامعہ میں ایس آئی او اسکول کا انعقاد

۶/۵ جولائی ۲۰۱۸ء بروز پنجشنبہ وجمعہ مرکز الدعوۃ ہال میں دوروزہ ایس آئی او اسکول منعقد ہوا۔یہ پروگرام پانچ سیشن میں چلا۔اس پروگرام میں مندرجہ ذیل لوگوں نے مختلف سیشنوں میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا:

(۱) درس قرآن — عبداللہ امین (صدر یونٹ)
(۲) درس قرآن — برادر محمد رافع (صدر حلقہ ایس آئی او یوپی مشرق)
(۳) ملک کے بدلتے ہوئے حالت کا جائزہ — برادر مصدق مبین (مدیر چھاترومرش)
(۴) شہادت حق — محمد امجد
(۵) خرم مراد کی آخری وصیت — محمد عارف سردار فلاحی
(۶) مطالعہ لٹریچر اور ہمارا رویہ — مصدق مبین
(۷) سیرت رسولؐ کا انقلابی پہلو — مولانا ذکی الرحمان غازی فلاحی

(۸) بناؤ اور بگاڑ	عبداللہ امین
(۹) اقامت دین کا تصور	محمد رافع
(۱۰) قرآن کا مطلوبہ انسان	مولانا محمد طاہر مدنی صاحب
(۱۱) تصور آخرت	محمد اسد اللہ (سابق صدر حلقہ
(۱۲) سوشل میڈیا اور ہماری ذمہ داریاں	مصدق مبین
(۱۳) حب تنظیم اور اس کے تقاضے	محمد رافع (صدر حلقہ)

جمعیۃ الطلبہ کے ذمہ داران کا انتخاب نو

امسال کے لیے جمعیۃ الطلبہ کے نئے ذمہ داران کا انتخاب کچھ اس طرح عمل میں آیا:

(۱) سکریٹری	محمد عاصم
(۲) لائبریرین	ابوسعید کشمیری
(۳) معتمد خطابت	انعام الرحمٰن
(۴) معتمد تحریر	عبداللہ ثناء اللہ
(۵) معتمد رسائل و جرائد	محمد آصف
(۶) معتمد کھیل	منظر جمال
(۷) معتمد صفائی و باغبانی	صابر محفوظ

جمعیۃ الطالبات کی ذمہ داریوں پر انتخاب نو

امسال کے لیے جمعیۃ الطالبات کی ذمہ داریوں پر انتخاب نو کچھ اس طرح عمل میں آیا:

(۱) سکریٹری	یمنی پرویز
معاون	آمنہ عبدالقیوم
(۲) معتمد خطابت	تنزیلہ ذوالفقار
معاون	خیر النساء
(۳) معتمد کتابت	روفیضہ عبداللہ
معاون	عنبرین فاطمہ

(۴) معتمد لائبریری	ادیبہ قیس
معاون	صدف حیات
(۵) معتمد رسائل	تسنیم انصاری
معاون	ماریہ سعید
(۶) معتمد کھیل وورزش	بشریٰ اشتیاق
معاون	حراء راشد
(۷) معتمد صفائی وباغبانی	سمیہ سہیل
معاون	اقصیٰ خالد

مولانا عبدالرحمٰن ندوی صاحب کی تذکیر

۸/جولائی ۲۰۱۸ بروز یکشنبہ ابواللیث ہال میں جناب مولانا عبدالرحمٰن ندوی صاحب کی ایک تذکیر بزبان عربی ہوئی۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ علم کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اسی لیے سب سے پہلی وحی میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آپؐ نے علم کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ جو علم دین حاصل کرتا ہے اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کردیتا ہے۔ اس طرح مزید یہ بھی کہا کہ علم کے لیے جدید وقدیم کی اصطلاح درست نہیں ہے بلکہ علم نافع اور علم غیر نافع کی تقسیم درست ہے۔ کیونکہ احادیث اور دعائے ماثورہ میں بھی ہے۔ اللہم انی اعوذ بک من علم لاینفع۔ حصول علم کا مقصد ہے کہ ہم اللہ کو پہچانیں۔ یہ علم کھانے کمانے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ علم اس لیے ہے کہ ہمیں معلوم ہوجائے کہ ہم کیسے انسان بنیں۔

جناب مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب کی تذکیر

۱۴ جولائی ۲۰۱۸ء بروز شنبہ بعد نماز عشاء جامعہ کی مسجد میں نگران اعلی جناب مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب کی ایک تذکیر ہوئی۔ آپ نے اپنی تذکیر میں فرمایا کہ طلبہ نظم وضبط کے ساتھ رہیں۔ جامعہ کے جملہ قواعد وضوابط کی پابندی کریں۔ کیونکہ تعلیم بغیر تربیت کے بیکار ہے۔ اسی لیے جامعہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ پھر آپ نے جامعہ کے جملہ قواعد وضوابط کی تفہیم کرائی۔

لکچر سیریز کا آغاز

پہلا محاضرہ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب

۲۸/ جولائی ۲۰۱۸ بروز شنبہ بعد نماز مغرب ابواللیث ہال میں لکچر سیریز کا آغاز ہوا۔ پہلا محاضرہ جناب مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب (استاذ حدیث وفقہ) کا بعنوان ''فقہ اسلامی اور اس کے ادوار'' ہوا۔ آپ نے فقہ اسلامی کے چھ ادوار کا تفصیل سے تذکرہ کیا:

(۱) عصر النبوۃ (۲) عہد الخلفاء الراشدین (۳) دوسری صدی کی ابتداء سے لے کر سقوط دولت امویہ تک (۴) دوسری صدی سے لے کر چوتھی صدی تک (۵) چوتھی صدی کے نصف آخر سے شروع ہو کر سقوط بغداد (۶۵۶ھ) تک (۶) اور موجودہ دور۔

ان تمام ادوار کا مولانا نے تفصیل سے تذکرہ فرمایا اور ان ادوار کی اہم فقہی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اخیر میں مولانا نے طلبہ کے سوالات پر تشفی بخش جوابات دیے۔

ریفریشر کورس برائے معلمین ومعلمات پروگرام

۲۹/ جولائی ۲۰۱۸ء بروز یکشنبہ مولانا ابواللیث ہال میں ایک پروگرام ریفریشر کورس برائے معلمین ومعلمات (جملہ شعبہ جات) منعقد ہوا۔ جس میں افتتاحی کلمات مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے پیش کیے۔ مدرسین کے اوصاف پر جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے گفتگو کی۔ طریقہ تدریس کے عنوان پر جناب ڈاکٹر افضال احمد فلاحی صاحب (شبلی نیشنل کالج) نے اظہار خیال کیا۔ صدارتی خطبہ جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب (ناظم جامعہ) نے پیش کیا۔

دوسرے سیشن میں تدریس کا عملی نمونہ پیش کیا گیا۔ تدریس کا عملی نمونہ برائے شعبہ ابتدائی و ثانوی (طلبہ وطالبات) جناب مولانا کمال الدین فلاحی کی صدارت میں ہوا جس میں مندرجہ ذیل حضرات نے تدریس کا عملی نمونہ پیش کیا۔

(۱) ناظرہ قرآن	حافظ ارشاد احمد صاحب
(۲) انگریزی	جناب ماسٹر آفتاب عالم صاحب
(۳) ریاضی	جناب ماسٹر اظفر صاحب

اسی طرح تدریس کا عملی نمونہ برائے شعبہ اعلی (طلبہ وطالبات) جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔جس میں مندرجہ ذیل لوگوں نے تدریس کا عملی نمونہ پیش کیا۔

(۱) فقہ مقارن (فضیلت سال دوم) جناب مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب
(۲) حدیث (عربی چہارم) جناب مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب
(۳) عربی ادب (عربی چہارم) جناب جمیل احمد فلاحی صاحب

تدریس کے عملی نمونہ کے بعد معلمین و معلمات کی طرف سے تبصرہ ہوا۔اور اخیر میں صدارتی کلمات مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے پیش کیے۔کلمۂ تشکر صدر مدرس شعبہ اعلی جناب مولانا انیس احمد فلاحی مدنی صاحب نے پیش کیے اور نظامت کے فرائض جناب مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب نے انجام دیے۔

جناب مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب کی تذکیر

۳۰؍جولائی ۲۰۱۸ء بروز سہ شنبہ ابواللیث ہال میں نائب صدر مدرس جناب مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب نے تذکیر کرتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ کا ایک نظام ہے اس نظام کی پابندی ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے،بغیر پابندی کے کوئی نظام نہیں چلتا ہے۔جو بھی نظام جامعہ میں بنتا ہے اس کا مقصد صرف اور صرف آپ کا فائدہ ہوتا ہے۔آپ کے فائدے کے لیے نظام بنتا ہے اس لیے آپ نظام کی پابندی کریں، خالی گھنٹیوں میں غیر درسی کتب کا مطالعہ کریں۔اپنے اوقات کو موبائل میں ضائع نہ کریں۔اپنے وقت کا صحیح استعمال کریں۔اللہ ہمارا حامی وناصر ہو۔

صدر انجمن کی جانب سے ایک اہم اطلاع

برائے جملہ فارغین جامعہ

محترم فلاحی برادران

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ بخیر ہوں گے۔

انجمن کے اجلاس شوری منعقدہ ۸/اپریل ۲۰۱۸ء میں اجلاس عام کے متعلق یہ فیصلہ ہوا تھا کہ نومبر ۲۰۱۸ء میں کیا جائے گا۔ جناب سید راشد حامدی فلاحی صاحب کو کنو یز اور جناب نعیم احمد غازی فلاحی صاحب کو معاون بنایا گیا تھا۔ ان دونوں حضرات نے اس ذمہ داری سے بعد میں معذرت پیش کی۔ اس وجہ سے اجلاس عام کو آئندہ سال کے لیے موخر کیا جاتا ہے۔ آئندہ کی تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

والسلام

آپ کا بھائی

مشرف حسین صدیقی

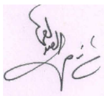

صدر انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

بھساول یونٹ کی ایک اہم نشست

۲۹/اپریل ۲۰۱۸ء کو بھساول یونٹ کے مقامی اجتماع کا آغاز ڈاکٹر محمد یونس فلاحی کے درس قرآن سے ہوا۔ ڈاکٹر موصوف نے سورہ نساء کی آیت ۵۸/ کے حوالہ سے امانت کے وسیع مفہوم کو قرآن وسنت اور عہد صحابہ وتابعین کے زریں کارناموں کی روشنی میں مؤثر طریقے سے بیان کیا۔

۸/اپریل کی مرکزی مجلس شوری میں لیے گئے بعض اہم فیصلے اور اہم تجاویز بھی زیر بحث آئیں۔

اس نشست میں مجوزہ اجلاس نومبر ۲۰۱۸ء کے لیے منصوبہ بندی بھی کی گئی اور اتفاق رائے سے یہ بات طے کی گئی کہ اس اجلاس سے قبل مہاراشٹر کے اضلاع اورنگ آباد، اکولہ، اور ناسک میں سکونت پذیر فلاحی برادران کے لیے شہر بھساول میں ایک اجلاس ملت نگر مسجد میں منعقد کیا جائے گا، ان شاء اللہ۔ اس موقع پر موجود فلاحی برادران کو اجلاس عام میں شرکت کے لیے آمادہ کیا جائے گا نیز انجمن ہاسٹل کے لیے تعاون کی جانب بھی رغبت دلائی جائے گی، ان شاء اللہ

اس نشست میں مقامی صدر جناب شبیر حیدر فلاحی صاحب، جناب فیصل فلاحی صاحب، جناب الطاف فلاحی صاحب، جناب ابوفیصل فلاحی صاحب اور جناب ڈاکٹر یونس فلاحی صاحب شریک ہوئے۔